ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

MARCH 97

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیات نو

جلد ۲ شمارہ ۳

مارچ سنہ ۱۹۸۷ء

مدیر منتظم — نور محمد فلاحی

مدیر — طارق فارقلیط فلاحی

○ مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

●

قیمت فی شمارہ	۳ روپے
سالانہ تعاون	۳۰ روپے
خصوصی تعاون	۱۰۰ روپے
غیر ممالک سے	۱۵ امریکی ڈالر

خط و کتابت کا پتہ

دفتر مجلہ حیات نو، بلریاگنج اعظم گڈھ، یوپی

شاداب آفسیٹ پریس ٹانڈہ ۲۷۶۱۲۱ کتابت: عبدالرحیم اعظمی

نقوش حیات نو

ایڈیٹر کا خط			
	قارئین کے نام	ایڈیٹر	۳
بحث و نظر			
	سورہ توبہ پر کچھ مزید روشنی	مولانا جلیل احسن ندوی	۴
	غیر عربی زبان میں ذکر و دعا اور خطبہ جمعہ کی شرعی حیثیت	عبد المجید ندوی	۸
	بابری مسجد کے عنوان ... اسلام میں	سلطان احمد اصلاحی	۲۱
	جاہلی اشعار میں نظریۂ انتحال اور اس کے اسباب	صباح الدین اعظمی	۱۳
	موازنہ انیس و دبیر پر ایک نظر	شہاب الدین ریسرچ اسکالر علیگڑھ	۴۲
	دروزی کون ہیں؟	ماخوذ (تکبیر پاکستان)	۵۱
عظمت کے مینار			
	حضرت طفیل بن عمرو دوسی	ابو جاوید (متعلم جامعہ)	۳۴
وفیات	یہ جامعہ انہیں کا خواب ہے	ماسٹر حفیظ فیض آباد گنج	۵۵
وقت کی آہٹیں	تہذیب جدید کے کرشمے	[illegible]	۳۱
گل و ثمر ادب			
	متاع آخر شب	تابش مہدی	۵۷
شعر و نغمہ			
	غزل	شاکر نسیم	۳۳
حلقۂ یاراں		اطہر احسن فلاحی، عبید اللہ فہد فلاحی، محمد خالد صدیقی	۶۱
جامعہ کے لیل و نہار		ادارہ	۶۳

ایڈیٹر کا خط

قارئین کے نام

قارئین کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جامعۃ الفلاح ہندوستان کی ایک معروف و مشہور درسگاہ ہے جس نے بہت ہی کم مدت میں کافی ترقی کی اور شمالی ہند و پاکستان میں پہنچ گیا۔ اور اب ملک و ملت کی ضرورت بنتا جا رہا ہے۔ جامعۃ الفلاح کے فارغین نے ۲۴ نومبر ۱۹۸۰ء کو انجمن طلبہ قدیم جامعہ کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور حیات نو کو اپنے آرگن کی حیثیت سے جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت سے آج تک حیات نو مختلف انداز سے کبھی سائیکلو اسٹائل، کبھی لیتھو اور کبھی [illegible] آفسیٹ پر، کبھی باقاعدگی اور کبھی بے قاعدگی سے نکلتا رہا۔ تاہم جنوری ۱۹۸۵ء سے مارچ ۱۹۸۸ء تک اس کا کوئی شمارہ شائع نہیں ہوا۔ البتہ معیار معلوم ہے اب بھی وہ بہت پیچھے تھا۔ کچھ تو صلاحیت کی کمی، کچھ وقت کی تنگی اور کچھ نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے اس کا معیار بہت اعلیٰ نہ ہو سکا لیکن اب بہت دیر تک آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ اب آپ کے درمیان ایک ایسے شخص کو لا رہا ہوں جس کے تعارف کی ضرورت نہیں پھر بھی [illegible] متفق ہے اور یہ خوش قسمتی ہے میرے استاد بھی ہوتے ہیں۔ آپ نے تدریس کے زمانہ میں اپنی تدریسی خدمات کو بڑی محنت، لگن اور دلسوزی سے نبھائی اور بہت سے طلبہ کی زندگیوں کو سنوارنے میں ایک نمایاں رول ادا کیا۔ یوں تو اساتذہ کے سلسلہ میں میرا ایک نقطۂ نظر رہا ہے تاہم یہ کہنے میں مجھے کوئی تکلف نہیں ہے کہ تین اساتذہ نے میری زندگی کو کافی متاثر کیا۔ علمی حیثیت سے مولانا جلیل احسن ندوی نے میرے دل کو جھنجھوڑا، تو اخلاق و کردار میں مولانا عنایت اللہ سبحانی نے اپنے اثرات ڈالے اور محنت و لگن کا جذبہ مولانا رحمت اللہ اثری سے کسی حد تک ملا۔ مولانا محترم سے یہ امید حق بجانب ہے کہ ان کی رہنمائی میں حیات نو اپنی علمی معیار کی بلندیوں کو پہنچے گا۔ اور یہ دور اس کا سنہری دور ہوگا۔

مجلہ حیات نو ایک علمی، تحقیقی اور تعمیری مجلہ ہے آپ اس کی توسیع و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں یہی ہماری خواہش و آرزو ہے۔ خدا ہمارا حامی و ناصر ہو۔

[illegible] فلاحی

۱۹۹۴/۲/۱۹

مولانا جلیل احسن ندوی؟

سورہ توبہ پر کچھ مزید روشنی

"استاذ محترم مولانا جلیل احسن ندوی کا طریقہ تعلیم منفرد، سادہ اور دلنشیں تھا۔ جو بات بھی کہتے غیر مبہم، واضح اور دوٹوک ہوتی تھی۔ مگر دوسرے کرم فرما، خاص طور سے جو ان سے بھرپور استفادہ کرتے تھے متعلقین کی تعلیم ہی اس کی زندگی کا سرمایہ ہوتی تھی جسمیں مولانا مرحوم کی چار کتابیں شامل ہوتی تھیں۔ دوران تعلیم اکثر بچے مولانا کی رایوں کو تحریر کر لیتے۔ اکثر میں بھی مولانا کی رایوں کو تحریر کر لیا کرتا۔ اب انھیں نوٹس کو حیات نو میں منتقل کر رہا ہوں" "(مدیر)"

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ .... اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۱-۴)

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مَنْبُوْذَةٌ اِلَى الَّذِيْنَ ۱

خدا اور رسول کی علیحدگی پھینکی جا رہی ہے ان مشرکین کی طرف جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا۔

مشرکین سے مراد مشرکین مکہ ہیں اور معاہدہ سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔ یہ معاہدہ سنہ ۶ھ میں ہوا تھا۔ خطاب مسلمانوں سے ہے۔

فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ

پس تم لوگ ملک میں چار مہینہ چل پھر لو۔ متفکرانہ طور پر اور یقین کر لو کہ تم لوگ اللہ کو عاجز اور بے بس نہیں کر سکتے ہو اور اس پر یقین کر لو کہ اللہ کفر کرنے والوں کو ذلیل کر دے گا۔ (۲)

وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ لِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَصَرُّوْا عَلَى الْكُفْرِ

اس آیت میں خطاب کا رخ براہ راست مشرکین کی طرف ہو گیا ہے۔ خطاب کی یہ تبدیلی دھمکی کی شدت اور فیصلہ کن ہونے کی دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو چار مہینہ کی مہلت اس وجہ سے دی تاکہ وہ غور و فکر کر لیں۔ اور خوب سوچ سمجھ لیں کہ جو روش انھوں نے اختیار کی ہے اس کا انجام کیا ہوگا اور تاکہ یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ اگر مہلت دی ہوتی تو ہم نیکوکار ہوتے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

بڑے حج یعنی یوم نحر کو جو مشرکین حج کو آئیں گے ان میں اعلان کر دیا کہ اللہ علیحدہ ہے مشرکین سے یعنی ان کے معاہدہ سے، اسی طرح اس کا رسول بھی ان سے علیحدہ ہے۔ پس تم لوگ اے مشرکو، اگر توبہ کرو اور ایمان لاؤ تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہوگا۔ اور اگر تم نے اب بھی روگردانی کی تو یقین کر لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے بلکہ وہ سخت سزا دے گا۔ کافروں کو خوشخبری دے دو دردناک عذاب کی اس دنیا میں اور آخرت میں۔

اذان: اس کا عطف براءۃ پر ہے۔ اعلان، منادی

الناس: مراد مشرکین جو حج کرنے آئیں گے۔

یوم الحج الاکبر: سے مراد یوم نحر ہے۔ (سئل عن النبی عن الحج الاکبر فاجاب هو یوم النحر)

بشارت: جو لوگ بشارت کا مفہوم خوشی لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہاں طنز ہے لیکن جو لوگ بشارت کے معنی خبر لیتے ہیں وہ یہی ترجمہ کرتے ہیں۔

اس آیت میں مشرکین مکہ سے جو معاہدہ حدیبیہ ہوا تھا وہ پھینکا جا رہا ہے۔

"تمام اہل سیر و محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیتیں سنہ ۹ھ رجب کے مہینہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ سنہ ۹ھ میں کوئی مشرک تھا ہی نہیں اس لئے تمام امت کا جو متفق علیہ فیصلہ ہے وہ درست نہیں معلوم ہو رہا ہے۔ یہ آیتیں سنہ ۸ھ میں نازل ہوئی ہیں اور اس سال کے یوم نحر میں اعلان کرنے کا حکم ہے۔"

سورہ توبہ کی ۱ تا ۴۲ آیتوں کے بارے میں مولانا جلیل احسن ؒ کی رائے جمہور سے بالکل الگ ہے، اور جو عبارت نقل کی گئی ہے وہ مولانا کی اپنی عبارت ہے، اور اس سے پہلے حیات نو دوری ۸۸ کے شمارہ میں جو تجزیاتی نوٹ آیا ہے اس میں مولانا فرماتے ہیں: "ابوسفیان کے مدینہ پہنچنے سے پہلے سورہ توبہ کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں جو ۱ سے ۴۲ آیتوں پر مشتمل ہیں۔ ان آیات میں سورہ انفال کی آیت۔ واما تخافن من قوم خيانة فانبذ اليهم على سواء ان الله لا يحب الخائنين (۵۸) کی رو سے مشرکین کو ان کا معاہدہ پھینکا جارہا ہے، اور ان کو چار مہینے کی مہلت دی جارہی ہے کہ اس عرصہ میں اچھی طرح غور و فکر کرلو اگر اسلام لے آئے تو ٹھیک ہے ورنہ مسلمانوں کو یہ ہدایت دی جارہی ہے کہ چار مہینہ کی مدت گزر جانے کے بعد جہاں پاؤ قتل کرو، ان کی معاشی ناکہ بندی کرو، ان کی گھات میں بیٹھو، خبردار ان سے نئی صلح نہیں ہوگی، ان کے لئے تین راستے ہیں۔ ۱۔ یا تو یہ عرب اسلامی مقبوضات سے باہر چلے جائیں۔ ۲۔ یا اسلام لائیں۔ ۳۔ یا جنگ کے لئے تیار ہوجائیں۔"

مولانا کا کہنا یہ تھا کہ آیات کا تیور خود ہی اپنے زمانہ کی نزول کی نشاندہی کر دیتا ہے۔ مکہ اور مدینہ کی آبادی اور اس کے قرب و جوار کے مشرکین سے ۹ھ تک مسلمان جو پہنچ چکے تھے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اسلام پورے جزیرہ عرب میں ایک غالب قوۃ اور طاقت کی حیثیت سے اپنا وجود منوا چکا تھا اس کو چیلنج کرنا مشرکین عرب کے بس کی بات نہ تھی بلکہ جنگ موتہ اور غزوۂ تبوک کی وجہ سے روم و ایران کی سپر طاقتیں بھی بے دست و پا نظر آرہی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ مسلمان اس پوزیشن میں تھے کہ اپنے اندر پل رہے سانپوں - منافقین - کو کچل سکیں، ایسی شکل میں فاذا انسلخ الاشهر الحرم فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم وخذوهم واحصروهم واقعدوا لهم كل مرصد "کا الٹی میٹم سمجھ میں نہیں آتا۔ اکا دکا جو مشرکین بچ گئے تھے ان کی حیثیت ثانوی تھی، ان کو دھمکی کی ضرورت ہی نہیں تھی وہ خود بخود اسلامی معاشرے کا جزء بن جاتے کیونکہ اصل قوت تو کفار مکہ کی تھی جو دین کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی وہ بہت پہلے فتح مکہ کے ذریعہ ٹوٹ چکی تھی۔ صلح حدیبیہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قریش کی اس سب سے بڑی قوت کو زیر کرنے کی ایک شعوری کوشش تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے فتح عظیم سے تعبیر کیا تھا اور اب اس معاہدہ کے توڑ دینے پر سرزنش اور دھمکی کا یہ انداز بھی کفار قریش، ان کے حواریوں اور اعوان و انصار کے

لئے ہی مناسب ہے، چونکہ کفار مکہ ہی نقض عہد کے مرتکب ہوئے تھے اس لئے حضور نے ان پر حملہ کرکے مکہ فتح کرلیا، اور دوسروں کو، اعلان کے بعد یہ مہلت دی گئی۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ

البتہ وہ مشرکین جنھوں نے معاہدہ کیا پھر اس میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کی اور تمھارے مقابلے میں کسی کی مدد نہیں کی اور نہ ہی کسی کی پشت پناہی کی، ان سے ان کا معاہدہ ان کی مدت تک مکمل کرو۔ بیشک اللہ متقیوں کو محبوب رکھتا ہے۔

إلّا منقطع ہے۔ الذين عاهدتم من المشركين ثم لم ينقصوا شيئا ولم يظاهروا عليكم أحدا۔ اس کی خبر محذوف ہے

تقوی۔ عہد کا پاس و لحاظ کرنا مراد ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے نقض عہد کیا ہے، دوسرے کی پشت پناہی کی ہے، ان سے معاہدہ توڑ دیا گیا اور اس آیت میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ کسی کی پشت پناہی کی اور نہ ہی نقض عہد کیا اس لئے معاہدہ ان کے ساتھ ان کی مدت تک باقی رہے گا۔

فارم ۴

ماہنامہ مجلہ حیات نو

مقام اشاعت: بریاگنج، اعظم گڑھ

وقفہ اشاعت: ماہنامہ

مالک: انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح بریاگنج اعظم گڑھ

پرنٹر و پبلشر: نور محمد جامعۃ الفلاح بریاگنج اعظم گڑھ

اڈیٹر: نور محمد جامعۃ الفلاح بریاگنج اعظم گڑھ

میں نور محمد پرنٹر، پبلشر و اڈیٹر تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا وضاحتیں میری علم و اطلاع کے مطابق صحیح ہیں۔

نور محمد

عبدالمجید ندوی

غیر عربی زبان میں ذکر و دعا اور خطبۂ جمعہ کی شرعی حیثیت (۲)

سنت کی تعریف میں صاحب البحر فرماتے ہیں:

"ان السنة ما واظب علیه النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکن ان کانت لا مع الترک فهو دلیل السنة المؤکدة وان مع الترک احیاناً فهو دلیل غیر المؤکدة وان اقترنت بالانکار علی من لم یفعله فهو دلیل الوجوب" [1]

صاحب فتح القدیر علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

"السنة ما واظب علیه الرسول صلی اللہ علیہ وسلم مع الترک احیاناً"

اصول و قواعد مذکورہ بالا سے واضح ہو رہا ہے کہ کسی امر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام کی مواظبت پائی جاتی ہو تو مجرد مواظبت اس کے سنت مؤکدہ ہونے کے لئے دلیل کافی نہیں ہے بلکہ یہ مواظبت دو امور سے مشروط و مقید ہے۔

(الف) امر مواظب علیہ سے مقصود اقتداء المسلمین ہو۔

(ب) امر مواظب علیہ کی درجہ بندی کرنے والی وجہ ہو، کیونکہ یہ تو ہر درجہ کا ہو سکتا ہے فرض بھی ہوتا ہے، واجب بھی اور سنت مؤکدہ بھی ہو سکتا ہے اور غیر مؤکدہ بھی بلکہ مباح بھی۔

ہمارے علمائے کرام میں سے جو لوگ خطبۂ جمعہ کی عربی زبان کے اختیار کرنے کو سنت مؤکدہ اور ترک کو مکروہ تحریمی کہہ رہے ہیں وہ ایک ایسی بات کہہ رہے ہیں جس کے بارے میں انہیں خود بھی نہیں معلوم کہ وہ کیوں کہہ رہے ہیں، سوائے اس کے کہ کچھ لوگ پہلے سے یہی کہتے آرہے ہیں کہ مواظبت دلیل السنة المؤکدة ہے اور سنت مؤکدہ کا ترک مکروہ تحریمی ہے، کافی و شافی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ لکھنوی مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے قدرے مدلل و مفصل گفتگو کی ہے اور اپنی تحقیق ذیل کے لفظوں میں کی ہے:

"قلت انه یجوز عنده مطلقاً لکن لا یخلو عن الکراهة والکراهة اما

هی لمخالفة السنة لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابه قد خطبوا دائماً بالعربیة ولم ینقل عن احد منهم انهم خطبوا الخطبة ولو خطبة غیر الجمعة بغیر العربیة"

اس فتوی کے بعد علامہ نے یہ بحث کی ہے کہ مواظبت بالعربیة علی خطبة الجمعة پانچ اسباب میں سے کسی ایک یا زیادہ کے باعث ہو سکتی تھی۔

(۱) غیر عربی زبان میں عدم حاجت کی بناء پر (۲) یا کسی امر مانع کی بناء پر (۳) یا عدم تنبہ کی بناء پر (۴) یا تکاسل کی بناء پر (۵) یا کراہت و عدم مشروعیت کی بناء پر۔

پھر فرماتے ہیں کہ ان اسباب میں سے کوئی سبب موجود نہیں تھا، اس لئے کراہت و عدم مشروعیت اپنے آپ متعین ہوگئی۔ علامہ موصوف رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بحث قیمتی ہے لیکن پھر بھی حرف آخر نہیں ہے۔ چند وجوہ قابل غور ہیں۔

اولاً یہ کہ اس طرح کے منطقی استدلال سے محض خطبۂ جمعہ ہی کی عربی زبان کو اختیار کرنا سنت مؤکدہ نہ ہوگا بلکہ اس منطقی صغری کبری پر اور دیگر امور جو صادق آئیں گے ان کا حکم بھی یہی ہوگا مثلاً قرآن مجید کی تفسیر و تفہیم کی عربی زبان کا بھی یہی حکم ہوگا کیونکہ اس کی عربیت بھی سنت متوارثہ ہے اور مواظبت اس پر پائی جاتی ہے اور اسباب مذکورہ بالا میں سے کوئی سبب بھی موجود نہیں تھا۔ حاجت اس بات کی تھی کہ جو لوگ مضامین قرآن سے عربی نہ جاننے کی وجہ سے ناواقف ہیں انہیں واقف کرانے کے لئے اس کی تفہیم و تفسیر غیر عربی میں کی جائے اور مانع بھی معدوم تھا کیونکہ صحابۂ کرام اور تابعین و تبع تابعین میں بہت سے لوگ عجمی زبانوں سے واقف تھے۔ اور جہاں تک عدم تنبہ اور تکاسل کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ ان قدسی نفوس کے بارے میں تصور بھی لرزا دینے والا ہے۔ پس اس میں کراہت و عدم مشروعیت اپنے آپ متعین ہوگی لہذا تفہیم و تفسیر قرآن کی عربی زبان سنت مؤکدہ ہوگی اور اس کا ترک مکروہ تحریمی کیونکہ القرون الثلاثة المشهود لها بالخیر کی اس پر مواظبت ہے اور بعد والوں کے عمل کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

علامہ موصوف کی بحث یہ ہے:

"وهو لا یخلو اما ان یکون لعدم الحاجة الیه، او لوجود مانع عنه،

او لعدم الحاجة اليه، او لتكاسل عنه، او لكراهة وعدم مشروعية والاولان منتفيان لانا قد ذكرنا ان الحاجة في تلك الازمنة ايضاً اليه كانت موجودة وان كانت بالنسبة الى حاجة بلادنا قليلة، ولو لم يكن مانع يمنع عنه بالكلية لانهم كانوا مقتدرين على الالسنة العجمية وكذا الثالث والرابع ايضاً مفقودان لانه بعيد في الامور الشرعية عن النبي صلى الله عليه وسلم واصحابه ومن تبعهم بل مثله لا يظن به بعلماء الشريعة فكيف بهم، واذا انتفت الوجوه الخمسة تعينت الكراهة ،، ے

۲۔ ثانیاً یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی صحابی ایسے نہیں تھے جو امام و خطیب رہے ہوں اور عربی زبان پر اچھی طرح قادر نہ رہے ہوں اور غیر عربی پر اچھی طرح قادر رہے ہوں۔

۳۔ ثالثاً یہ کہ صحابہ کرامؓ میں کوئی صحابی ایسے نہ تھے جو فضیلت کی طلب و تلاش میں سرگرداں نہ رہتے رہے ہوں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی زبان کو دیگر زبانوں پر لسانی و شرعی دونوں حیثیتوں سے فضیلت حاصل ہے۔ لسانی فضیلت تو ظاہر ہے۔ شرعی فضیلت کی بنیاد یہ حدیث و آثار بھی ہیں:

"من احسن منكم ان يتكلم بالعربية فلا يتكلم بالفارسية"، اخرجه الحاكم من حديث ابن عمر وفي سنده ضعف، واخرجه البيهقي عن ابن عمرؓ انه قال لا تعلموا رطانة الاعاجم وعنه انه سمع رجلا يتكلم بالفارسية في الطواف فاخذ بعضده وقال ابتغ الى العربية سبيلا، ۳ے

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذوق و ذہن ہر معاملہ میں بالخصوص شرعی و دینی معاملات میں ہمیشہ افضل کو اختیار کرنے اور مفضول کو ترک کرنے کا تھا، ایسی صورت میں عربی زبان میں فضیلت کو ترک کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا، نہ وہ حضرات ایسا کر سکتے تھے

۴۔ رابعاً یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ممالک عجم میں فاتحانہ داخل ہوئے اور فاتح قوم ہمیشہ اپنی تہذیب و تمدن کی بالادستی اپنا فرض رکھتی ہے اور یہ معلوم و مسلم ہے کہ تہذیب کے عناصر میں عقیدہ و زبان کو سب سے اونچا مقام حاصل ہے۔

۵۔ خامساً یہ کہ اگر خطبہ جمعہ کو تذکیر قرار دیا جائے تو قرآن مجید کی تفسیر و تفہیم سے مشابہ ہوگا کیونکہ قرآن کو بھی ذکر کہا گیا ہے "وَنَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ" اور محض قربت و تعبد کے ہونے میں بھی مشابہت ہے اور عبادات اور قربات میں مورد شرع پر ہی اقتصار کیا جائیگا "ويقتصر على مورد الشرع" (اعلاء السنن) ایسی صورت میں خطبہ وغیرہ بہ زبان غیر عربی خلافت کے بعد کی تمام صورتیں بدعت و ضلالت ہی قرار پانے کی مستحق ہیں جیسے کتاب دیکھ کر پڑھنا، تغنی کے ساتھ پڑھنا، تلاوت و قرأت کی صورت میں پڑھنا سلاطین کی مدح و ستائش پر مشتمل ہونا، ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں طریق سلف میں نہیں پائی جاتی تھیں، اس سلسلہ میں سید العلماء علامہ سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی درج ذیل رائے بڑی قابل توجہ ہے:

"جمعہ کے خطبوں کی اصلاح بھی ضروری ہے، اہل حدیث، احناف اور بعض دیگر علماء نے تو اردو میں خطبہ کو جائز تسلیم کر لیا ہے لیکن بہت علماء کو تامل ہے، اگر اتنا بھی تسلیم کر لیا جائے کہ عربی کے ساتھ ساتھ اردو میں دینا جائز ہے تو بہت کچھ اصلاح ہو سکتی ہے، کسی اختلافی مسئلہ کو چھیڑنے کا جرم نہ عائد کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ غیر مجوزین کے پاس عمل سلف کے سوا غیر عربی میں خطبہ کے عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ عمل سلف سے استدلال کے متعلق عرض ہے کہ طریق سلف کے مطابق خطبہ میں حسب ذیل خصوصیتیں ہوتی تھیں، وہ عربی زبان میں ہوتا تھا، وہ زبانی پڑھا جاتا تھا کسی کتاب میں دیکھ کر نہیں پڑھا جاتا تھا، اس کی صورت تلاوت و قرأت کی نہیں ہوتی تھی بلکہ مختصر زبانی تقریر کی ہوتی تھی، اس میں آیات و احادیث کے التزام کے ساتھ مسائل حاضرہ تمہید و دیگر مطالب کی گنجائش ہوتی تھی۔ ایک خطبہ لکھا ہوا یا رٹا ہوا صدیوں تک نہیں پڑھا جاتا تھا، وہ سلاطین کی مدح و ستائش سے پاک ہوتا تھا، اس میں تغنی نہیں ہوتی تھی، اس میں مقفٰی و مسجع بے معنی عبارت نہیں ہوتی تھی مگر ان تمام خصوصیات کو بلا تکلف ترک کر دیا اور صرف عربی کی خصوصیت پر زور دینا قرین صواب نہیں ہے، اگر عربی کی قید نہ رہے تو حسن فوائد کے علاوہ محض ایک بدعت کو قبول کر کے متعدد بدعات سے ہم محفوظ ہو جائیں گے، ے

سطور بالا میں اب تک جو کچھ پیش کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

١۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی رو سے علاوہ قرأت قرآن کے اندرون نماز کے تمام اذکار دادعیہ بھی مطلق جائز ہیں اور صاحبین کے مسلک کے اعتبار سے بھی بروایت صاحب البدائع جائز ہیں۔

٢۔ بیرون نماز کے اذکار کو غیر عربی میں ادا کرنا بالاتفاق جائز ہے اور خطبۂ جمعہ بھی چونکہ بیرون نماز کا ذکر اسلئے بالاتفاق مطلقاً جائز ہے، اگرچہ اس کو صاحبین کے نزدیک قائم مقام نماز نقل کیا جاتا ہے، لیکن اس کی حیثیت شرط کی ہے رکن نماز کی نہیں ہے اسلئے اس پر حکم وہی ہوگا جو بیرون نماز کے اذکار کا ہے۔

٣۔ خطبہ جمعہ میں عربی زبان پر مواظبت اس کے سنت مؤکدہ ہونے کی تنہا دلیل شافی نہیں ہے کیونکہ وضو میں مسواک پر مواظبت ہے مگر وہ سنت مؤکدہ نہیں ہے، سنت مؤکدہ یا واجب و فرض ہونے کے لئے مواظبت کے ساتھ ساتھ دو اور دلیلوں کی احتیاج ہوتی ہے۔ ایک جو یہ ثابت کرے کہ اس سے تشریع اور اقتداء مقصود ہے اور دوسری وہ جو یہ ثابت کرے کہ اس کا وجہ طاں ہے۔

٤۔ قرآن کی تفسیر و تفہیم میں باوجود قرون ثلاثہ کی مواظبت کے عربیت کا بلا نکیر ترک کیونکر اختیار کیا گیا؟ اس کو خطبۂ جمعہ کے ساتھ رکھکر غور و فکر کا موضوع بنایا جائے تو وہ بھی مکروہ تحریمی سے ان حضرات کے نزدیک کم نہیں ہونا چاہئے جو خطبۂ جمعہ کی عربیت کے ترک کو مکروہ تحریمی سمجھتے ہیں۔

٥۔ خطبہ جمعہ میں اگر عربیت کا ترک مکروہ تحریمی ہے تو اسے کتاب دیکھکر پڑھنا، تلاوت و قرأت کی صورت میں پڑھنا، خطبہ میں مسائل حاضرہ و متجددہ سے گریز کرتے ہوئے لکھا ہوا پرانا ہوا پڑھنا، سلاطین کی مدح و ستائش پر مشتمل ہونا، اس میں تکلف کا ہونا، مقفیٰ و مسجع بے معنی عبارت کا ہونا بدرجہ اولیٰ مکروہ تحریمی بلکہ بدعت و ضلالت ہے کیونکہ یہ طریق سلف یا دوسرے لفظوں میں سنت متوارثہ کے خلاف ہے۔

اس پوری بحث کا نتیجہ مختصر الفاظ میں یہ نکلا کہ خطبۂ جمعہ غیر عربی زبان میں دینا مکروہ تحریمی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی کہا جاسکتا ہے کیونکہ عربی کی افضلیت بہرحال

مسلم ہے اور کراہت تنزیہیہ دراصل افضل کے ترک اور مفضول کے اختیار کرنے کا اثر ہے۔ اخیر میں دو حوالوں کا اعادہ ملاحظہ کریں۔

١۔ علامہ شامی کی رائے:

"ولا یبعد أن الدعاء بالفارسیۃ مکروہ تحریما فی الصلوۃ وتنزیہا خارجہا فلیتأمل و لیراجع" [۵]

٢۔ علامہ لکھنوی کی رائے:

(الف) "ما کونہ تنزیہا خارج الصلوٰۃ فلقول النبی [۳]

"من احسن منکم ان یتکلم بالعربیۃ فلا یتکلم بالفارسیۃ"

(ب) واما کونہ تحریما فی الصلوٰۃ فلکونہ مخالفا للسنۃ"

(ج) "لکن ینبغی ان یستثنی من الکراھۃ خارج الصلوٰۃ من یعتاد التکلم بالفارسیۃ و یثقل علیہ التکلم بالعربیۃ فینبغی ان لا یکرہ لہ خارج الصلوٰۃ الدعاء بالفارسیۃ لانہم قد ذکروا فی آداب الدعاء ان یکون مع الخشوع والخضوع ولذا نہی عن تکلف الاسجاع لئلا یشوش قلب الداعی عن الالتفات الی ربہ تعالیٰ بالاشتغال بالاسجاع وظاہر ان من یثقل علیہ التکلم بالعربیۃ لا یحصل لہ الخشوع فیہا حسبما یحصل فی غیرہا" [۶]

اور اگر سید العلماء علامہ سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق ایک بدعت کو قبول کر لینے سے متعدد بدعات سے گلو خلاصی مل جاتی ہے تو پھر کراہت تنزیہیہ بھی زائل ہو جاتی ہے اور عین مصلحت شرعیہ کا حصول ہے۔ فقط۔ ھذا ما ظہر لفہمی القاصر واللہ تعالیٰ ناصر۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔

حواشی:۔ [۱] بحوالہ احکام النفائس سابق [۲] احکام النفائس ص ۲۲
[۳] احکام النفائس ص ۱ [۴] خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ العلماء ہند منعقدہ کلکتہ ۱۹۲۶ء ص ۵۹
[۵] شامی جلد ۱ ص ۳۵۰ [۶] الاذکار ص ۱۲

صباح الدین اعظمی

جاہلی اشعار میں نظریۂ انتحال اور اسکے اسباب

یہ موضوع ہمیشہ اختلافی رہا ہے کہ جو باتیں پچھلے لوگوں کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ آیا ان کی نسبت صحیح ہے یا غلط۔ اس سلسلے میں کسی قوم کی تاریخ، کسی اہم شخصیت کے اقوال یا کسی ادیب یا شاعر کے کلام کی مثالیں دیکھی جاتی ہیں جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نسبت صحیح ہے جبکہ کوئی دوسرا کہتا ہے کہ نہیں کسی اور کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے وہ حقیقت میں کسی اور کا کلام یا قول ہے۔ اور حقیقت واقعہ ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ ہم کسی بھی قدیم کتاب کو من و عن نہیں تسلیم کر سکتے۔ اسی بنا پر تمام آسمانی کتابوں پر جو کہ کلام پاک کے علاوہ ہیں ہمارا ایمان ہے کہ ان میں تحریف کی گئی ہے۔ بعض تاریخی، سماجی یا جغرافیائی عوامل ہوتے ہیں یا کسی مسرت پسند طبقے کی شیطانی حرکت ہوتی ہے جو کہ ان میں تحریف کا باعث ہوتی ہے، یا پھر قوم کے عقیدے اپنی خواہشات کے مطابق ان میں تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی آسمانی کتاب بجز قرآن مجید کے اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں کہ کلام پاک کی حفاظت کا ذمہ اسی ذات نے لیا ہے جس نے کہ اس کو نازل کیا ہے۔ اسی طرح سے بزرگ یا مذہبی شخصیات کی طرف منسوب کردہ روایات اکثر غلط ہوتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مرید یا عقیدت مند ان کی طرف عقیدت میں بہت سی مافوق العادت باتیں منسوب کر دیتے ہیں۔ اسی ضمن میں شعراء کے کلام بھی آتے ہیں جن کے بارے میں قطعی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ شعر یا قصیدہ جس شاعر کی طرف منسوب ہے آیا یہ اسی کے ہیں یا کسی اور کے ان کی طرف غلط انداز میں منسوب کر دیئے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر زبان کے ادب میں اختلافی بحثیں موجود ہیں لیکن یہ بات بھی ہے کہ محققین اس بات کو دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ اس کی نسبت کہاں تک صحیح ہے اور پھر بڑی حد تک یہ مسئلہ اختلافی نہ رہ کر اتفاقی بن جاتا ہے۔ البتہ بعض اشعار یا قصائد مختلف فیہ رہتے ہیں۔

تحقیق کے سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ لسانیات کا ہے کہ ایک ماہر لسانیات یہ بتا سکتا ہے کہ یہ ادبی شہ پارہ کہاں تک صحیح منسوب ہے کیونکہ ہر شاعر اور ادیب کا ایک مخصوص اسلوب ہوتا ہے

الفاظ کے انتخاب میں اس کا ایک ذوق ہوتا ہے۔ اس بنا پر بڑی آسانی سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس قصیدے میں کون سا شعر اجنبی لگتا ہے۔ پھر ایک محقق شاعر کی زندگی، سماجی حالات، جغرافیائی عوامل کو سامنے رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شاعر اپنی شاعری میں ایسے واقعات کا ذکر اور وہاں پر اپنی موجودگی کو ثابت کرتا ہے جو کہ تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ہیں تو یہاں پر اس کا امکان ہوتا ہے کہ کسی اور نے شعر کہکر جھوٹے ہی اس شاعر کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ عربی اصطلاح میں اس کو "انتحال" کہتے ہیں۔

اس مقالے میں میں جو بات لانے والا ہوں وہ عربی ادب یعنی جاہلی دور کی شاعری سے متعلق ہے۔ ہم جائزہ لیں گے کہ قدیم جاہلی شاعری میں کہاں تک انتحال ہوا ہے، اور محققین نے کس حد تک اس میں کام کیا ہے وغیرہ یہ کہ انتحال کے اسباب کیا ہیں؟ اور یہ کہ کیا اس دور میں بھی ہم یقین نہیں کر سکتے کہ جو قصائد قدیم جاہلی شعراء کی طرف منسوب ہیں ان کی نسبت صحیح ہے اور یہ کہ بیسویں صدی میں قضیہ انتحال ایک نئی شکل میں سامنے آیا جس نے کہ نئی مشکلات کو جنم دیا۔

انتحال کا مطلب یہ ہے کہ کسی کلام کی نسبت ایسے شخص کی طرف کی جائے جس نے کہ اس کو نہ کہا ہو، یہ کہ کسی کلام کو اپنی طرف منسوب کیا جائے جب کہ وہ کسی دوسرے کا ہو۔ ابن منظور نے لسان العرب میں ذکر کیا ہے۔ "انتحل فلان شعر فلان او قول فلان: اذا ادعاه انه قائله" [1] اب سوال یہ کہ عربی اشعار یعنی جاہلی اشعار میں انتحال ہوا ہے کہ نہیں اس کے لئے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ابن قتیبہ نے الشعر والشعراء میں اعشیٰ کا ایک قصیدہ پیش کیا ہے:

استأثر الله بالوفاء وبالحمد — وولى الملامة الرجلا [2]

پورا قصیدہ نقل کرنے کے بعد ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ

هذا الشعر منحول ولا اعلم فيه شيئا يستحسن الا قوله [3]

يا خير من يركب المطي ولا — يشرب كاسا بكف من بخلا

کہتے ہیں یہ شعر منحول ہے (مراد پورے قصیدے سے ہے) اور اس میں صرف ایک شعر درست ہے۔

یہاں پر ابن قتیبہ نے اس وجہ سے شعر کی تردید کی کیونکہ پورے قصیدے میں صرف ایک شعر ہی ان کو ایسا ملا جو کہ اعشی کے اسلوب کے مطابق ہے۔

اسی طرح سے دیوان حماسہ میں باب المراثی کا یہ قصیدہ بھی مشکوک سمجھا گیا ہے۔

ان بالشعب الذی دون سلع — لقتيلا دمه ما يطل

اس گھاٹی میں جو کہ سلع کے سامنے ہے، ایک ایسا مقتول ہے جس کا خون رائیگاں نہیں جائیگا۔

اس کے بارے میں محققین نے کہا ہے کہ یہ شعر خلف الاحمر نے کہا ہے اور اس کو تابط شرا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تابط شرا بدوی تھا، اصمعی نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے جب کہ قصیدے میں "سلع" کا ذکر ہے جو کہ مدینے میں ایک پہاڑ ہے۔ اس سلسلے کی بعض مثالیں آگے آئیں گی۔ تاہم اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ جاہلی اشعار میں انتحال ہوا ہے اور یہ کہ یہ مرحلہ دور ہی میں رواج پا گیا تھا۔ اسی وجہ سے اعشی نے ایک جگہ بہت ہی ناپسندیدہ انداز میں اس کا ذکر کیا ہے۔ کہتا ہے:

فکیف انا و انتحال القوافی — بعد المشیب کفی ذاک عارا

مطلب یہ کہ کہاں میں اور کہاں میرا بڑھاپے میں شعر کی غلط نسبت کرنا، یہ تو بڑی ہی شرمندگی کی بات ہوگی۔

جہاں تک یہ سوال ہے کہ انتحال کے اسباب کیا ہیں اور کیونکر یہ مرحلہ پیدا ہو سکا۔ اس کے عوامل کیا ہیں؟ تو اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جاننے کی یہ ہے کہ عرب امی تھے۔ ان میں تعلیم کا فقدان تھا۔ لکھنے پڑھنے کا رواج بالکل نہیں تھا۔ کسی بھی چیز کی حفاظت کا دارومدار حافظے پر تھا۔ ہر شاعر کے ساتھ ایک راوی ہوتا تھا جو کہ اس کے اشعار کو یاد کرتا تھا۔ ایسی صورت حال میں یہ عین ممکن ہے کہ کوئی بھی شعر کسی کی طرف منسوب ہو جائے یا یہ کہ کوئی شاعر کسی شعر کو گڑھے اور اہم شاعر کی طرف منسوب کرکے اپنی شعری اہمیت بڑھانے کی کوشش کرے یا پھر کسی اہم شاعر کے شعر کو اپنی طرف منسوب کرکے اپنی شعری اہمیت جتلائے یا یہ کہ کوئی رئیس اپنی مدح کے کسی قصیدے کو بڑے شاعر کی طرف منسوب کرے تاکہ یہ ثابت ہو کہ اس بڑے شاعر نے اس رئیس کی مدح کی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ایسا ہوتا رہا ہو کیونکہ اس دور میں دواوین کی تدوین کا رواج بہت کم تھا۔ بعد میں جب اس کا رواج ہوا تو مدونین نے اس میں زیادہ احتیاط نہ برتی بلکہ اپنی طرف سے بھی اضافے کئے۔ اس سلسلے میں خلف الاحمر

اور حماد الراویہ خاصے بدنام ہیں۔

جب یہ احساس ہوا کہ جو شعری مجموعہ موجود ہے، وہ مشکوک ہے تو ادبا و محققین نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس سلسلے میں ابو عبیدہ، اصمعی اور عمرو بن العلاء کا نام لیا جاتا ہے۔

لیکن قضیہ انتحال کو جس شخص نے سنجیدگی کے ساتھ لیا وہ ابن سلام جمحی (م ۲۳۱ھ) ہیں، انھوں نے اپنی کتاب طبقات الشعراء میں اس موضوع پر بحث کی ہے۔ اس میں انھوں نے ان اسباب کی طرف نشاندہی کی ہے جو کہ انتحال کا باعث ہوئے ہیں۔ اس کتاب کی پہلی جلد میں انھوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ یہاں پر ہم اس کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

کہتے ہیں: "شعر جاہلی میں ایسے بھی اشعار ہیں جو کہ موضوع ہیں جن میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ نہ تو کوئی خاص معنی لئے ہوئے ہیں اور نہ ہی ادبی لحاظ سے درست ہیں"

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ابن اسحاق نے سیرت لکھنے میں بہت سے منحول و موضوع اشعار نقل کئے ہیں، انھوں نے ایسے افراد کی طرف شعر منسوب کئے ہیں جنھوں نے کہ شعر ہی نہیں کہے ہیں نیز یہ کہ قوم عاد و ثمود کی طرف بھی اشعار منسوب کئے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی لحاظ سے یہ درست نہیں ہے کیونکہ قرآن اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کی تمام یادگاریں ملیا میٹ کر دی گئی ہیں:

هل ترى لهم من باقية

دوسرے یہ کہ یہ اشعار اسی اسلوب میں ہیں جو کہ اس وقت رائج تھا اگر یہ شعر قوم عاد و ثمود کے ہوتے تو طرز و اسلوب مختلف ہوتا۔ دراصل ابن اسحاق نے اس وقت جو اشعار عوام میں مقبول تھے ان کو اپنی کتاب میں درج کر دیا۔ اسی وجہ سے ابن ہشام نے جب سیرت ابن اسحاق کی تہذیب کی تو انھوں نے اس طرح کی تمام خرافات کو باہر کر دیا اسی وجہ سے سیرت ابن اسحاق کے بجائے آج سیرت ابن ہشام رائج ہے۔ یہ دراصل اس وجہ سے ہوا کہ ابن اسحاق کا ذوق شعری نہیں تھا اس وجہ سے وہ شعر کے انتخاب میں غلطی کر بیٹھے اور منحول اشعار کا ذکر کیا۔

ابن سلام نے انتحال کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ جو افراد شعر کی روایت کرتے تھے بسا اوقات کسی شعر کی روایت کے سلسلے میں غلطی کر جاتے تھے۔ لکھتے ہیں۔

السبب الثانی: هو اختلاط الامر علی بعض الرواة فیروون الشعر لشاعر وهو لیس له ثم تعتمد العرب به ذالک۔ (۱۱)

دوسرا سبب یہ ہے کہ بعض راوی روایت میں غلطی کر جاتے ہیں اور ایسے شعر کسی شاعر کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جو اس کا نہیں ہوتا بلکہ مصنوع ہوتا ہے۔

مثلاً نابغہ کا مشہور شعر

ولست بمستبقٍ اخاً لا تلمّه ∴ علی شعثٍ ای الرجال المهذّب

ترجمہ: تم ایسے آدمی کو باقی نہیں رکھتے جس کی پراگندگی پر تم اس کی اصلاح نہیں کر پاتے۔ تو کونسا آدمی مہذب ہے یعنی سلیقہ مند ہے۔

بنی مالک بن سعد کے کسی شاعر کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

انتحال کا تیسرا سبب ابن سلام نے یہ بتایا ہے کہ "بعض قبائل جن کے یہاں فخر، مجد، شرف میں اشعار کم ہوتے تھے، ان کے شاعر ان موضوع پر اشعار کہکر گزرے ہوئے شعراء کی طرف منسوب کر دیتے تھے"(۱۲) اسکا مقصد دراصل یہ ہوتا تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ ان کا قبیلہ بہت پہلے سے مجد و شرف میں آگے رہا ہے کیونکہ اشعار ہی دراصل کسی قبیلے کے مناقب و مفاخر پر دلالت کرتے تھے۔

انتحال کا ایک سبب یہ ہے کہ بہت سے شعراء نے کسب کے لئے استاذ شعراء کے کلام میں اپنے اشعار بڑھائے، یعنی یہ کہ کسی شاعر نے کسی بڑے شاعر کے قصیدے میں اپنے مطلب کے اشعار بڑھا دیے ہوں تاکہ بادشاہوں کے دربار میں سنا کر انعامات حاصل کیا جائے اور عوام میں مقبولیت حاصل کی جائے۔

اس سلسلے میں ابن سلام نے ابن داؤد بن متمم بن نویرہ کی مثال دی ہے جس نے کہ متمم بن نویرہ کے قصیدے میں اپنی طرف سے اشعار بڑھائے لیکن چونکہ متمم بن نویرہ کا شعری اسلوب ابن داؤد کے شعری اسلوب سے کہیں مختلف ہے اس وجہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ ابن داؤد نے انتحال کیا ہے۔(۱۳)

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات الشعراء جلد اوّل)

یہ بات واضح انداز میں سامنے آچکی ہے کہ انتحال کے اسباب کیا ہیں، لیکن جہاں تک یہ سوال ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ کون سے اشعار منحول ہیں یا کون سے قصائد غلط منسوب کر دیئے گئے ہیں تو اس سلسلے میں سب سے بہتر چیز ناقد کا ذوق ہے ساتھ ہی ساتھ اس دور کے اسلوب سے

پوری واقفیت ضروری ہے۔ ساتھ ہی شاعر کے اسلوب کا باریک بینی سے مطالعہ اس کی زندگی کے احوال تاریخی پس منظر، سماجی اور جغرافیائی حالات کا جائزہ ضروری ہے۔ ان اصولوں کی روشنی میں کوئی بھی ناقد یہ سمجھ سکتا ہے کہ کون سا شعر منحول یا موضوع ہے یا یہ کہ کون سا قصیدہ کسی راوی نے کہکر غلط انداز سے منسوب کر دیا ہے۔ بڑی حد تک محققین اور شارحین نے ان اشعار اور قصائد کی طرف نشاندہی کی ہے جو کہ منحول ہیں۔ لیکن کسی بھی قصیدے کے مطالعے کے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ بہرحال شعر کی حفاظت اس طرح نہیں ہوتی ہے جیسا کہ احادیث و سیرت کی کتابوں کی۔ لہٰذا کسی بھی تاریخی واقعہ کے سلسلے میں اشعار سے مدد تو لی جا سکتی ہے لیکن اسکو دلیل بنا کر تاریخ و سیر کی کتابوں کی تکذیب بہرحال دانشمندی کی بات نہیں ہے جبکہ یہ بات بھی سامنے موجود ہے کہ شعراء عام صورت سے خیالی بات کرتے ہیں اور کسی بھی واقعے کو تاریخی نہیں بلکہ اپنے انداز میں پیش کرتے ہیں۔

بیسویں صدی میں یہ قضیہ نئے انداز میں سامنے آیا ہے۔ مستشرقین کی ایک جماعت نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔ ان لوگوں نے کہا کہ مسلمان جس کلام کو جاہلی کلام کہتے ہیں وہ جاہلی کلام نہیں ہے بلکہ دوسری تیسری صدی کے شعراء نے کہکر اسلام سے پہلے کے لوگوں کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور مرجلیوث نامی مستشرق ہے اس نے اس موضوع پر ایک مقالہ لکھا جس کا کہ عربی ترجمہ بیروت سے "اصول الشعر العربی" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ دوسری تیسری صدی ہجری میں لوگوں نے جاہلی اشعار کے وجود کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد مشہور مصری ادیب طٰہٰ حسین نے ایک کتاب "فی الشعر الجاہلی" ترتیب دی بعد میں جب یہ کتاب طنز و طعن کا نشانہ بنی تو انھوں نے فی الادب الجاہلی کے نام سے ایک دوسری کتاب لکھی۔ فی الادب الجاہلی کے صفحہ ۶۵ پر وہ رقمطراز ہیں ان الکثرۃ المطلقۃ مما نسمیہ شعرا جاهلیا لیس من الجاهلیۃ فی شئ بل هی منحولۃ بعد الاسلام(۱۴)۔ ترجمہ: ان اشعار کی بڑی تعداد جس کو ہم شعر جاہلی کہتے ہیں وہ اشعار ہیں جو اسلام کے بعد کہے گئے ہیں۔

ان لوگوں نے اپنی تائید میں بہت سی دلیلیں دی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جاہلی اشعار دراصل منحول ہیں اور بعد کے شعراء نے اشعار کہکر اسلام سے قبل کے لوگوں کی طرف منسوب کر دیئے ہیں لیکن ان کے دلائل مضبوط نہ ثابت ہو سکے اور خود مستشرقین کی ایک جماعت نے ان آراء کی تردید کی چونکہ یہ بحث اب پرانی ہو چکی ہے اور بڑی حد تک اس کی تردید کی جا چکی ہے بلکہ یہ کہنا درست ہے کہ ان کی آراء کلی

طور پر غلط ثابت کی جا چکی ہیں اس لئے ان کو پیش کرکے ان کا ذکر نا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جہاں طور پر اس قصے کا تعارف بھی کافی معلوم ہوتا ہے۔ دراصل طٰہٰ حسین اور دیگر مستشرقین کا مقصد یہ تھا کہ ان ذرائع کو مشکوک کیا جائے جن کے ذریعہ شعر ہم تک ہمارے پاس پہنچا ہے، تاکہ پھر قرآن و حدیث کی روایت کو مشکوک سمجھا جائے لیکن یہ دراوہ دنیا شخص یہ سمجھتا ہے کہ قرآن و حدیث اور شعر جاہلی کی کس طرح سے حفاظت کی گئی ہے، نیز یہ کہ شعر جاہلی ہی سے عربیت کے اصول مرتب کئے گئے ہیں اور اسی کے مقابلے میں ہی تو قرآن کا ادب اور اعجاز نمایاں ہے۔

۱ لسان العرب	ص ۶۵۰	ج ۱۱	طبع بیروت
۲ الشعر والشعراء	ص ۲۷		"
۳ "	"		"
۴ دیوان الحماسہ	" ۳۴۲	باب المراثی	"
۵ "	"	"	"
۶ الشعر والشعراء	" ۱۹۷		"
۷ لسان العرب	" ۶۵۱	ج ۱۱	"
۸ طبقات الشعراء		ج ۱	"
۹ القرآن الکریم	الآیۃ "	سورۃ الحاقۃ	"
۱۰ طبقات الشعراء		ج ۱	"
۱۱ "		"	"
۱۲ "		"	"
۱۳ "		"	"
۱۴ فی الادب الجاہلی	ص ۵		"

مضامین خوشخط اور صفحہ کے ایک ہی طرف لکھکر روانہ فرمائیں۔

(ادارہ)

سلطان احمد اصلاحی

نابرابری کے عوامل ۔ اسلام کی نظر میں

اسلام کے تصور مساوات کے مطالعہ میں ایک دلچسپ بحث ان عوامل کی جانچ ہے جنھیں وہ دولت، رنگ اور نسل کے علاوہ دنیا کے اندر اونچائی نیچائی کے سلسلے میں موثر تسلیم کرتا ہے۔ قرآن نے متعدد مقامات پر دو طرح کے انسانوں کے درمیان موازنہ کیا ہے۔ ایک طرح کے لوگوں کو اس نے اونچا بتایا ہے اور دوسرے لوگوں کو ان سے کمتر قرار دیا ہے۔ برتری کے یہ تمام عوامل ایمان اور عمل صالح اور ان پر مرتب ہونے والے نتائج پر مشتمل ہیں۔ ذیل میں ایک ترتیب کے ساتھ ہم قرآن کے ان موازنوں کو نقل کریں گے، اور ان میں ذکر کئے گئے برتری اور کمتری کے عوامل کو الگ الگ نمایاں کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) **ایمان اور فسق**: قرآن کہتا ہے مومن اور فاسق ایک سے نہیں ہو سکتے۔ مومن کے لئے جنت کی دائمی نعمتیں ہیں اور فاسقوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔

أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ ۝ أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝

(سجدہ: ۱۸ - ۲۰)

کیا ایسا جو مومن ہے وہ اس کی طرح ہے جو نافرمان ہے۔ وہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ تو جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے تو ان کے لئے رہنے کے باغات ہیں۔ مہمانی ان کے عمل کے بدلے جو وہ کرتے تھے اور رہے وہ لوگ جو نافرمان ہیں تو ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ جب چاہیں گے کہ اس سے نکلیں تو اس میں لوٹا دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائیگا کہ چکھو آگ کے اس عذاب کو جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

(۲) **انسان کا جنتی اور جہنمی ہونا**: قرآن کے نزدیک جنتی لوگ ہی کامیاب ہیں۔

لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ

برابر نہیں ہیں جہنمی اور جنت والے، جنت والے

أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۔ (حشر — ۲۰) یہی کامیاب ہیں۔

(۳) راہِ خدا میں جہاد اور اس سے تخلف: اسی طرح قرآن کے نزدیک جن لوگوں نے اللہ کے راستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور جو لوگ بلا عذر گھر بیٹھے رہے یہ لوگ یکساں مرتبہ کے حامل نہیں:

لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۚ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

برابر نہیں ہیں مسلمانوں میں سے بیٹھ رہنے والے جن کو کوئی عذر نہیں ہے اور وہ جو جہاد کر رہے ہیں اللہ کے راستے میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ اللہ نے بڑھایا ہے جہاد کرنے والوں کو اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے بیٹھ رہنے والوں پر درجہ۔ اور ہر ایک سے اللہ نے اچھائی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ نے بڑھایا ہے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اجر عظیم دے کر (یعنی) ان کے لئے اس کی طرف سے بلند درجات ہیں اور بخشش اور رحمت ہے اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔)

(نساء : ۹۵، ۹۶)

(۴) اللہ کی راہ میں قتال اور انفاق اور اس سے گریز: اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ جن لوگوں نے مشکل حالات میں اللہ کے دین کی خاطر لڑائیاں لڑیں اور اپنا مال خرچ کیا وہ اس راہ میں پیچھے رہنے والوں سے اونچے ہیں:

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۚ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۚ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

اور تم کو کیا ہوا ہے کہ تم نہ خرچ کرو اللہ کے راستے میں جبکہ اللہ ہی کو حق ہے میراث آسمانوں اور زمینوں کی۔ تم میں سے برابر نہیں ہو سکتے وہ جنہوں نے خرچ کیا فتح کے پہلے اور لڑائی لڑی۔ بڑے ہیں درجے میں ان سے جنھوں نے خرچ کیا اس کے بعد اور لڑے۔ اور ہر ایک سے اللہ نے اچھائی کا وعدہ کیا ہے۔ اور اللہ کو خبر ہے اس کی جو تم کرتے ہو۔

(حدید — ۱۰)

(۵) اللہ کی راہ میں جہاد اور ہجرت اور قومی افتخار: اگر ایک طرف یہ لوگ ہوں جو یہ قربانیاں پیش کر رہے

ہوں اور دوسری طرف وہ لوگ ہوں جو محض قومی افتخار کے سہارے جی رہے ہوں، تو قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک یہ دونوں ایک سے (یکساں مرتبہ کے) نہیں ہو سکتے:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۘ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ

کیا تم نے بنا دیا حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنے کو اس کے مانند کہ جو ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور جہاد کیا اللہ کے راستے میں۔ یہ دونوں اللہ کے نزدیک برابر نہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ وہ جو ایمان لائے اور گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا اللہ کے راستے میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے وہ رتبے میں بڑھے ہوئے ہیں اللہ کے نزدیک اور یہی لوگ ہیں جو بامراد ہیں۔

(توبہ ۱۹ — ۲۰)

(۶) خلقِ خدا کے لئے نفع رسانی اور اس سے گریز: قرآن کے نزدیک یہ دو طرح کے انسان یکساں مقام کے حامل نہیں:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَىْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۚ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۚ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَىْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۚ هَلْ يَسْتَوِىْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(نحل — ۷۵، ۷۶)

اللہ نے مثال بیان کی ایک غلام جو پرایا مال ہے جسے کسی چیز پر قدرت نہیں۔ اور ایک وہ ہے جسے ہم نے دیا ہے اپنی طرف سے اچھی روزی اور وہ اس میں سے خرچ کرتا ہے کھلے اور چھپے۔ کیا یہ دونوں برابر ہیں۔ سب تعریف اللہ کے لئے ہے پر بہت لوگ نہیں جانتے۔ اور اللہ نے مثال بیان کی دو آدمیوں کی، ان میں سے ایک گونگا ہے جسے کسی چیز پر قدرت نہیں اور وہ اپنے آقا پر بوجھ ہے وہ اسے جہاں کہیں بھیجے وہ کچھ بھلا نہ کر سکے۔ کیا برابر ہو سکتے ہیں یہ اور وہ جو حکم کرے انصاف کا، اور وہ خود سیدھے راستے پر ہو۔

(۷) خدا کا خوف اور اس سے بے نیازی — ایک شخص وہ ہے جو دن رات خدا سے ڈرتا ہے اور دوسرا وہ جو اس سے بے نیاز ہو کر شرک کی آلودگی میں مبتلا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان دونوں کا درجہ مساوی نہیں ہو سکتا ہے:

وإذا مس الإنسان ضر دعا ربه منيبا إليه ثم إذا خوله نعمة منه نسي ما كان يدعو إليه من قبل وجعل لله أندادا ليضل عن سبيله قل تمتع بكفرك قليلا إنك من أصحاب النار ۞ أمن هو قانت آناء الليل ساجدا وقائما يحذر الآخرة ويرجو رحمة ربه قل هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون إنما يتذكر أولو الألباب ۞

(زمر : ۸، ۹)

اور جب انسان کو پہنچتی ہے کوئی سختی تو پکارتا ہے اپنے رب کو پکارنے لگتا ہے اسی کی طرف رجوع ہو کر پھر جب وہ اسے اپنی طرف سے نعمت بخش دیتا ہے تو بھول جاتا ہے جس کے لئے اس سے پہلے پکارا تھا اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتا ہے تاکہ اس کے راستے سے گمراہ کرے۔ کہہ دو برت لے اپنے کفر کے ساتھ تھوڑے دن، بیشک تو ہے جہنم والوں میں سے۔ بھلا وہ جو بندگی کرتا ہے رات کے پہروں میں سجدے کرکے اور کھڑے ہو کر، آخرت کا ڈر رکھتا اور اپنے رب کی مہربانی کی امید رکھتا ہے؛ کہہ دو کیا برابر ہو سکتے ہیں جو جاننے والے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے۔ نصیحت تو وہی پکڑتے ہیں جو سمجھدار ہیں۔

(۸) خوبکاری و بدکاری — اسی طرح ایک شخص خوبکار ہے اور دوسرا بدکار۔ قرآن کے نزدیک دونوں کے مراتب میں زمین و آسمان کا فرق ہے:

وما يستوي الأعمى والبصير والذين آمنوا وعملوا الصالحات ولا المسيء قليلا ما تتذكرون ۞ إن الساعة لآتية لا ريب فيها ولكن أكثر الناس لا يؤمنون ۞

(مومن : ۵۸، ۵۹)

برابر نہیں ہو سکتے ایک وہ جو اندھا ہے اور ایک آنکھ والا۔ اور وہ جو ایمان لائے اور نیک عمل کریں اور ایک وہ جو بدکار ہے۔ تم بہت کم سوچتے ہو۔ بیشک قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی دھوکہ نہیں لیکن اکثر لوگ یقین نہیں رکھتے۔

(۹) ایمان و عمل صالح اور اس کے برعکس اوصاف — قرآن کے نزدیک جو شخص ایمان اور عمل صالح کی روشنی پر عمل پیرا ہے، اور جو اس کے برعکس اوصاف کا حامل ہے وہ دونوں ایک سے نہیں ہو سکتے:

ومن أظلم ممن افترى على الله كذبا أولئك يعرضون على ربهم ويقول الأشهاد هؤلاء الذين كذبوا على ربهم ألا لعنة الله على الظالمين ۞ الذين يصدون عن سبيل الله ويبغونها عوجا وهم بالآخرة هم كافرون ۞ أولئك لم يكونوا معجزين في الأرض وما كان لهم من دون الله من أولياء يضاعف لهم العذاب ما كانوا يستطيعون السمع وما كانوا يبصرون ۞ أولئك الذين خسروا أنفسهم وضل عنهم ما كانوا يفترون ۞ لا جرم أنهم في الآخرة هم الأخسرون ۞ إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات وأخبتوا إلى ربهم أولئك أصحاب الجنة هم فيها خالدون ۞ مثل الفريقين كالأعمى والأصم والبصير والسميع هل يستويان مثلا أفلا تذكرون ۞

(ہود : ۱۸ - ۲۴)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو جھوٹ باندھے اللہ پر۔ یہی لوگ ہیں کہ پیش کئے جائیں گے اپنے رب کے سامنے اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ کہا تھا۔ سن لو اللہ کی لعنت ہے ان ظالموں پر جو کہ روکتے ہیں اللہ کے راستے سے اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں، وہ وہی ہیں کہ آخرت کو نہیں مانتے ہیں۔ یہ لوگ نہ تھے اللہ کو بے بس کرنے والے زمین میں اور نہ تھے ان کے لئے اللہ کے سوا کچھ حمایتی۔ ان کو دونا عذاب دیا جائے گا، یہ نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کا گھاٹا کیا اور گم ہو گئے ان سے وہ سب جو یہ جھوٹ باندھتے تھے۔ دور نہیں کہ یہی لوگ ہیں آخرت میں سب سے زیادہ گھاٹے والے۔ بیشک جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور اپنے رب کی طرف عاجزی کرتے رہے یہ لوگ جنت والے ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ دونوں گروہوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا، اور دوسرا دیکھنے والا، کیا ان دونوں کی شان ایک جیسی ہے، کیا پس تم سوچتے نہیں ہو۔

(۱۰) آخرت کی کامیابی اور ناکامی — اسی طرح قرآن کی نظر میں جو شخص آخرت میں کامیاب ہے اور جو اس زندگی میں ناکام ہے وہ دونوں یکساں نہیں ہیں۔

وَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ أَفَمَن وَعَدْنَاهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيهِ كَمَن مَّتَّعْنَاهُ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ۝

اور جو کوئی چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی رونق ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ زیادہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ کیا پس تم سمجھتے نہیں ہو۔ کیا پس وہ جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہے، اور وہ اس کو ملنے والا ہے وہ اسی طرح ہے جیسے ہم نے برتنے کو دے رکھا؟ دنیا کی زندگی میں سامان۔ پھر قیامت کے دن وہ پکڑا ہوا بلایا جائے گا۔

(قصص : ۶۰، ۶۱)

(۱۱) توحید اور شرک — اسی طرح ایک شخص ہے جس کے دل کی روشنی زندہ ہے، اور وہ نورِ ایمان سے منور ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جس نے اپنے دل کی آنکھیں پھوڑ لی ہیں اور ضلالت و گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ دونوں ایک سے نہیں ہو سکتے۔

قُلْ مَن رَّبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللَّهُ قُلْ أَفَاتَّخَذْتُم مِّن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۔

پوچھو کون ہے آسمانوں اور زمین کا رب۔ کہو اللہ۔ کہو کیا پھر تم نے اس کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں جو اپنے لئے کوئی اختیار نہیں رکھتے نہ نفع کا نہ نقصان کا۔ کہو کیا برابر ہیں ایک اندھا اور آنکھ والا، یا کیا برابر ہیں اندھیرے اور روشنی، یا انھوں نے ٹھہرائے ہیں اللہ کے شریک جنھوں نے پیدا کیا اسی طرح جیسا کہ اللہ نے پیدا کیا ہے اور یہ پیدا کرنا ان کی نگاہوں میں خلط ملط ہو گیا ہے۔ کہہ دو اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ اکیلا زبردست ہے۔

(رعد : ۱۶)

(۱۲) عقل و خرد کی پیروی اور اس سے محرومی — اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ ایک شخص ہے جو عقل و خرد کی پیروی کر رہا ہے اور رسول کا کہنا مانتا ہے، دوسرا وہ ہے جو خواہشات نفس کے پیچھے پڑ کر بالکل اندھا بہرا بن گیا ہے اور انکار و عناد کی روش اختیار کئے ہوئے ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ دونوں لوگ یکساں نہیں ہیں:

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ قُل لَّا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ۝

اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے ہیں مگر خوشخبری دینے کو اور ڈرانے کو۔ تو جو کوئی ایمان لائے اور نیک روش پکڑے تو ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور وہ جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کو عذاب پکڑے گا اس بنا پر جو وہ نافرمانی کرتے تھے۔ کہہ دو میں تم سے نہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ کہو کیا برابر ہیں ایک جو اندھا ہے اور آنکھ والا۔ کیا پس تم دھیان نہیں دیتے ہو۔

(انعام : ۴۸، ۵۰)

(۱۳) دل کی زندگی اور اس کی موت — اسی طرح قرآن کے نزدیک جن لوگوں کے دل زندہ ہیں اور وہ ہدایت الٰہی کو قبول کر رہے ہیں ان کا معاملہ ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جنھوں نے اپنے مسلسل انکار و عناد سے اپنے دلوں کو مردہ کر لیا ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۝ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ۝ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ۝ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ إِنَّ اللَّهَ

اور برابر نہیں ہو سکتے ایک جو اندھا ہے اور دیکھنے والا، اور نہ اندھیرا اور اجالا، اور نہ سایہ اور لو، اور نہیں برابر ہیں زندے اور مردے۔ بے شک اللہ سناتا ہے اسے جسے چاہتا ہے اور تو نہیں

يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ
مَّنْ فِى الْقُبُوْرِ ۝ (فاطر : ۱۹ - ۲۲)

سنانے والا ہے ان کو جو دبے پڑے ہیں قبروں میں پڑے ہیں۔

(۱۴) دل کی نرمی اور اس کی سختی قرآن کہتا ہے کہ کچھ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے نور ایمان سے منور کر دیا ہے۔ دوسرے لوگ ہیں جنھوں نے اپنی سرکشی کے باعث اپنے دلوں کو سخت بنا لیا ہے۔ قرآن کے نزدیک ان دو طرح کے انسانوں کے درمیان بعد المشرقین ہے :

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ
بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ
فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ۭ
اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ۝
اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ
فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ فَوَيْلٌ
لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ
اُولٰۗىِٕكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝
(زمر : ۲۱ - ۲۲)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اتارا آسمان سے پانی اور اسے چلا دیا زمین کے چشموں میں پھر وہ اس سے نکالتا ہو کھیتی مختلف رنگوں کی پھر وہ آتی ہے اپنے زور کو، پس تو دیکھتا ہے کہ وہ زرد پڑ گئی۔ پھر وہ اسے چورا چورا کر دیتا ہے۔ بیشک اس کے اندر نصیحت ہے سمجھ والوں کے لئے۔ بھلا وہ جس کے سینے کو کھول دیا اللہ نے اسلام کے لئے سو وہ اپنے رب کی طرف سے اجالے پر ہے۔ پس تباہی ہے ان کو جن کے دل سخت ہیں اللہ کی یاد سے۔ یہی ہیں جو کھلی گمراہی میں ہیں۔ (اب کون ہے جو ان دونوں کو برابر کہہ سکے۔)

(۱۵) ایمان اور علم اسی طرح قرآن کے نزدیک انسان کو اصلا بلندی ایمان اور علم کی بدولت حاصل ہوتی ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا
فِى الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ
انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

اے ایمان والو جب تم سے کہا جائے کہ کشادہ ہو جاؤ مجلسوں میں تو تم کشادہ ہو جاؤ اللہ تم کو کشادگی دیگا اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو تم اٹھ جاؤ۔ اللہ اٹھا دیگا ان لوگوں کو جو ایمان والے ہیں تم میں سے اور علم رکھتے ہیں

درجوں میں اور اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔ (مجادلہ : ۱۱)

(۱۶) ایمان اور خدا کی معیت اسی طرح قرآن کے نزدیک عزت و بزرگی کے حقدار وہ لوگ ہیں جو خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جنھیں خدا کی معیت نصیب ہے :

يَقُوْلُوْنَ لَىِٕنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ
لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۭ
وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ
وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝
(منافقون : ۸)

وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹے مدینے کو نکال دیں گے عزت والے ذلیل لوگوں کو، اور عزت تو اللہ کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور اہل ایمان کیلئے۔ لیکن یہ منافق نہیں جانتے۔

قومی افتخار کی بنیاد

جس طرح اسلام افراد کے سلسلے میں بزرگی و برتری کی تعیین میں ایمان اور عمل صالح جیسے اخلاقی اوصاف کا قائل ہے اسی طرح قومی افتخار کے سلسلے میں بھی وہ انہی اخلاقی اوصاف کو واحد اساس تسلیم کرتا ہے چنانچہ قرآن صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بحیثیت قوم کے کسی قوم سے دلچسپی نہیں۔ نہ کسی قوم کے ساتھ اس کا مخصوص طور پر کوئی تعلق ہے۔ اللہ کے نزدیک جو چیز معتبر ہے وہ ایمان اور عمل صالح ہے جو شخص ان اخلاقی متاع کا حامل ہوگا اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو اچھا بدلہ ملے گا۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا تعلق کس قوم اور کس گروہ سے ہے۔ البتہ جو شخص ان اوصاف سے عاری ہوگا تو کسی قوم سے نسبت اس کے کچھ کام نہ آئے گی :

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا
وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا
فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝
(بقرہ : ۶۲)

بات یوں ہے کہ جو لوگ مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں، اور جو عیسائی ہیں اور جو صابی ہیں انہیں سے جو ایمان لائے گا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور نیک عمل کرے گا تو ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا بدلہ ہے اور نہ ان کو کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

اہل کتاب کو گمان تھا کہ جس شخص کا تعلق یہودی اور نصرانی قوم سے ہے اسے جنت کا سرٹیفکیٹ

حاصل ہے، قرآن ان کا جواب ان لفظوں میں دیتا ہے:

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

(بقرہ : ۱۱۱ ، ۱۱۲)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہرگز جنت میں داخل ہوگا مگر وہ جو یہودی ہوگا یا عیسائی ہوگا۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔ کہدو لاؤ اپنی سند اگر تم سچے ہو۔ ہاں جو کوئی اپنے کو جھکا دے گا اللہ کے سامنے اور وہ بھلائی کرنے والا ہوگا تو اس کے لئے اس کا بدلہ ہے اس کے رب کے نزدیک اور نہ اس کو کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم کھائے گا۔

اسی طرح اہل کتاب کا خیال تھا کہ انسان کے راہ یاب ہونے کے لئے بس یہودی اور نصرانی قوم سے تعلق کافی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب تک وہ اس قومی پندار سے دستبردار ہوکر دین و ایمان کی سچی شاہراہ اختیار نہیں کریں گے اس وقت تک وہ خدا کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ عِيسَىٰ وَمُوسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ

وہ کہتے ہیں کہ ہو جاؤ یہودی یا عیسائی تم راہ پا جاؤ گے۔ کہدو نہیں ہم تو ابراہیم کے طریقے کے پیرو ہیں جو یکسو تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہدو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو اترا ہم پر اور جو اترا ابراہیم اسماعیل پر اسحاق، یعقوب اور اس کی اولاد پر، اور جو ملا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور تمام نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے ہم ان میں سے کسی کے بیچ فرق نہیں کرتے، پھر اگر وہ ایمان لائیں جس طرح کہ تم ایمان لائے ہو تو وہ راہ پر ہیں۔ اور اگر وہ پھریں تو وہی ہیں ضد پر، تو اللہ تمہاری طرف سے ان کے

(بقیہ ص ۲۵ پر)

الم

تہذیب جدید کے کرشمے

حکومت مہاراشٹرا کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۵ء میں صرف بمبئی شہر میں ۵۰ ہزار عورتوں نے اپنے حمل ضائع کرائے۔ ایسا اس وجہ سے کیا گیا کہ ان کی خواہش کے علی الرغم ان کے رحم میں ایک بچی پرورش پا رہی تھی اور بچیوں کی شادی اور جہیز کے لئے ان کے پاس مطلوبہ رقم نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ امیونیسینٹیسس، (رحم مادر میں جنین کی تشخیص کی تکنیک) کے بعد ہوا۔ ان میں ایسی عورتیں بھی شامل تھیں جن کے رحم میں بچہ پرورش پا رہا تھا مگر صحیح تشخیص نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے بھی اپنے حمل ضائع کرا دیئے۔ یہ تکنیک اب دیہاتوں میں بھی پھیل رہی ہے اور پرائیویٹ ڈاکٹر بھی اس کو استعمال کر رہے ہیں۔ کیا اب لڑکیاں ہندوستان میں نہیں پیدا ہوں گی؟ کیا ہم اس تہذیب کی طرف لوٹ رہے ہیں جس میں لڑکیاں زندہ در گور کر دی جاتی تھیں؟

• • •

حیدرآباد بھارت کا ایک مشہور شہر ہے اور حیدرآباد میں چار مینار کا علاقہ اور بھی مشہور ہے۔ روزانہ سیکڑوں افراد چار مینار کی بلندیوں سے شہر کا نظارہ کرتے ہیں اور سیر و سیاحت کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اس چار مینار سے ہزاروں کہانیاں جنم لیتی ہیں اور لاکھوں یادیں وابستہ ہوتی ہیں مگر ابھی کچھ دنوں پیشتر جنم لینے والی ایک کہانی بڑی بھیانک بھی ہے اور دردناک بھی۔ دیکھنے والے اس منظر کی تاب مشکل ہی سے لا سکتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک روز دن کی روشنی میں پانچ متحرک وجود چار مینار پر چڑھنے لگے۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے بلندیوں پر پہنچ گئے اور وہاں سے چھلانگ لگا دی۔ چشم زدن میں پانچ بے حس و حرکت لاشے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنی کہانی زبان حال سے سنا رہے تھے جبکہ کسی کے اندر سننے کی تاب نہ تھی۔ ان میں تین نوجوان غیر شادی شدہ بہنیں تھیں اور ایک نوجوان بھائی اور ایک کم عمر بہن۔ ایسا اس وجہ سے ہوا کہ وہ جہیز کا سامان فراہم نہیں کر سکتی تھیں۔

• • •

غیر مہذب سماج کی کہانیاں کچھ اس طرح ہوتی تھیں۔ ایک آدمی جوا کا رسیا تھا، وہ جوے میں اپنی ہر چیز کو داؤ پر لگا دیتا تھا یہاں تک کہ اپنی بیوی کو بھی۔ گویا پرانے زمانے میں عورتوں کی قدر صرف اتنی تھی کہ ان کو ایک سامان کی طرح داؤ پر لگا دیا جائے اور اب مہاراشٹر کے ایک ضلع بیڑ سے شروع ہونے والی ایک کہانی اس سے مختلف نہیں ہے۔ مہاراشٹر کے وزیر مال مسٹر آر ڈی پاٹل نے ریاستی قانون ساز کونسل میں ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ ضلع بیڑ کے ایک ساہوکار شیواجی راؤ بابو راؤ نے ایک عورت کو ہزار روپیے قرض کے عوض تقریباً تین سال تک اپنے یہاں گروی رکھا۔ بحث کے دوران ایک کانگریسی رکن مسٹر نے بتایا کہ یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں جس کی کوئی مثال نہ ملتی ہو ضلع بیڑ میں ایسی کتنی ہی مثالیں ہیں کہ تھوڑے پیسوں کے عوض عورتوں کو گروی رکھ لیا جاتا ہے۔ کتنا خوبصورت ہے ہمارا مہذب سماج! اور کتنے اچھے ہیں عورتوں کے حقوق۔

(بقیہ صفحہ یادداشت)

جناب ایڈیٹر صاحب حیات نو! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، انجمن طلبہ قدیم اے۔ ایم۔ یو شاخ کی ایک میٹنگ بروز منعقد ہوئی جس میں حیات نو کی توسیع اشاعت کا مسئلہ انتہائی اہمیت کا حامل تھا، جہاں اسکی توسیع اشاعت کے لئے لوگوں نے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں وہیں لوگوں نے اس کے غیر معیاری ہونے کا بھی شکوہ کیا، جو بجا تھا۔ ابھی ان کے اس شکوے کی تلافی بھی نہ کر پائے تھے کہ فروری کا حیات نو بنام کانفرنس نمبر موصول ہوا جس نے اس کے غیر معیاری و ایڈیٹر کے غیر اخلاقی ہونے کا واضح ثبوت فراہم کر دیا۔ روداد سفر کی کہانی ہی جس انداز سے آپ نے تنظیم کے خد و خال کو بیان کرنے کا جو دروازہ نکال کر حیات نو کی پالیسی و طریق کار کی خلاف ورزی کی ہے اس کے لئے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور مشورہ دوں گا کہ آپ تنظیم سے درخواست کریں کہ وہ آپ کے اس کارنامے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے فروری کی اس اشاعت کی تنظیمی سرگرمیوں کی نشو و نما کے لئے لے لے۔ والسلام

آپکا محمد خالد بستوی، بی۔ یو۔ ایم۔ ایس علی گڑھ

شاکر تسلیم

غزل

کر گیا ہر راز فاش ... ان لبوں کا ارتعاش
ہائے پھر لو دے اٹھی ... میرے دل کی ہر خراش
چاند تاروں کو حضور ... جانے ہے کس کی تلاش
اس خموشی نے کئے ... کیسے کیسے راز فاش
پھر میری آنکھوں کو ہے ... ان کے دامن کی تلاش
سب سے امید کرم ... ساری دنیا سے نراش
وقت کے ہاتھوں میں ہیں ... کس قدر رنگین تاش
گفتگوئے دوستاں ... اور اتنی دلخراش
کل تھی ان کی جستجو ... آج ہے اپنی تلاش
ہائے رے نیرنگیاں ... بت شکن اور بت تراش
وادی کربل میں ہے ... اب ہماری بود و باش
اب حدود عشق میں ... جرم ہے فکر معاش

کب تک اے شاکر پھروں
خود اٹھائے اپنی لاش

حضرت طُفیل ابن عمرو دوسیؓ

تحریر:- الدکتور عبدالرحمان رأفت الباشا
ترجمانی: ابو جاوید

حضرت طفیل ابن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ زمانہ جاہلیت میں قبیلۂ دوس کے سردار، عرب کے قابل ذکر اشراف اور معدودے چند اصحاب مروت میں سے تھے۔ وہ بڑے مہمان نواز اور صاحب جود و سخا آدمی تھے۔ مہمانوں کی بکثرت آمد کی وجہ سے ان کے یہاں کھانے کی دیگیں ہمیشہ چولھوں پر چڑھی رہتیں اور ان کے دروازے آنے والے مہمانوں کے استقبال کے لیے ہر وقت کھلے رہتے، وہ بھوکوں کو کھانا کھلاتے خوف زدہ لوگوں کو امان دیتے اور پناہ طلب کرنے والوں کو پناہ دیتے۔ ان ساری خوبیوں کے علاوہ وہ نہایت باشعور اور ذہین ادیب، بڑے نازک خیال اور حساس شاعر اور کلام و بیان کے حسن و قبح اور صحت و سقم کی تمیز میں غیر معمولی درک رکھنے والے نقاد تھے۔

حضرت طفیلؓ بن عمرو اپنے قبیلہ کے علاقہ تہامہ کو چھوڑ کر مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار قریش کے درمیان حق و باطل کی زبردست کشمکش برپا تھی۔ اور فریقین میں سے ہر ایک اپنے اور اپنی جماعت کے لئے اعوان و انصار فراہم کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق و انصاف کے ہتھیار سے کام لے کر لوگوں کو بندگئ رب کی دعوت دے رہے تھے اور کفار قریش ہر قسم کے حربے استعمال کرکے اس دعوت کی مخالفت و مزاحمت میں جٹے ہوئے تھے اور لوگوں کو اس سے باز رکھنے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کر رہے تھے۔

مکہ پہنچ کر حضرت طفیلؓ نے محسوس کیا کہ وہ کسی تیاری کے بغیر اس معرکہ میں شامل اور بلا قصد و ارادہ اس کی موجوں میں داخل ہوتے جا رہے ہیں۔ نہ تو وہ اس مقصد سے مکہ آئے تھے نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان برپا اس کشمکش کا انھیں وہم و گمان ہی گذرا تھا اس وجہ سے اس کشمکش سے وابستہ ان کی ناقابل فراموش اور عجیب و غریب داستان سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ اس داستان کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "جب میں مکہ پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی سرداران قریش میری طرف

لپکے اور انھوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا اور مجھے بڑی عزت و تکریم سے نوازا۔ پھر ان کے بڑے بڑے سردار اور سربرآوردہ لوگ میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھ سے کہنے لگے: طفیل! تم ہمارے شہر میں آئے ہو، اور یہ شخص جو اپنے آپ کو نبی کہتا ہے، اس نے ہمارا سارا معاملہ خراب کر کے رکھ دیا ہے اس نے ہماری جمعیت کو منتشر اور ہماری جماعت کو پراگندہ کر دیا ہے۔ ہم لوگوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں تم کو اور تمھاری قیادت و سرداری کو بھی وہی خطرہ نہ لاحق ہو جائے جس سے ہم لوگ دوچار ہیں۔ اس لئے تمھارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم نہ تو اس شخص سے کوئی بات کرنا، نہ اس کی کوئی بات سننا کیونکہ اس کی باتیں بڑی جادو اثر ہیں، اس کی زبان میں بلا کی تاثیر ہے۔ یہ شخص اپنی ان باتوں کے ذریعہ باپ بیٹے، بھائی بھائی اور شوہر بیوی میں تفریق کر دیتا ہے۔

حضرت طفیل اپنی کہانی کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

"خدا کی قسم وہ لوگ مسلسل اس شخص کی عجیب و غریب باتیں مجھے سناتے رہے اور اس کے حیرت انگیز کارناموں سے میری اپنی ذات اور میری قوم کے متعلق مجھکو خوفزدہ کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے اس بات کا عزم مصمم کر لیا کہ میں نہ اس شخص سے ملوں گا نہ اس سے کلام کروں گا نہ اسکی کوئی بات سنوں گا اور جب میں خانۂ کعبہ کے طواف اور اس میں رکھے ہوئے ان بتوں سے برکت حاصل کرنے کے لئے مسجد حرام میں گیا جن کی ہم تعظیم و توقیر کرتے تھے تو اس خوف سے کہ کہیں محمدؐ کی کوئی بات میرے کانوں میں نہ پڑ جائے، میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ مسجد میں داخل ہوا تو میں نے محمدؐ کو کعبہ کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں مشغول پایا۔ ان کا طریقۂ عبادت ہمارے طریقۂ عبادت سے مختلف تھا۔ وہ منظر مجھے بہت اچھا لگا اور ان کے عبادت کے اس طریقے کو دیکھ کر میں وجد و مسرت سے جھوم اٹھا اور غیر ارادی طور پر بتدریج ان سے قریب ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ان کے بالکل نزدیک پہنچ گیا، اور خدا کو یہی منظور تھا کہ ان کی زبان سے نکلنے والے کچھ الفاظ میرے کانوں تک پہنچ جائیں۔ چنانچہ میں نے ان سے ایک بہترین کلام سنا اور اپنے دل میں کہا: طفیل! تمھاری ماں تمھارے سوگ میں بیٹھے، تم ایک سمجھدار اور صاحب بصیرت شاعر ہو، کلام کا حسن و قبح تم پر مخفی نہیں ہے۔ آخر اس شخص کی باتیں سننے میں کیا چیز تمھارے آڑے آ رہی ہے۔ اگر اس کی باتیں اچھی ہوں گی تو قبول کر لینا اور اگر بری ہوں گی تو انھیں چھوڑ دینا۔"

حضرت طفیلؓ کہانی کی اگلی کڑی اس سے جوڑتے ہوئے کہتے ہیں۔

"یہ سوچ کر میں وہیں رُک گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اور جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو میں بھی ان کے پیچھے اندر چلا گیا اور ان سے کہا کہ "اے محمدؐ! آپ کی قوم کے لوگوں نے مجھ کو آپ سے دور رکھنے کے لئے آپ کے متعلق مجھ سے بہت سی ایسی ویسی باتیں کہی ہیں۔ وہ مسلسل مجھ کو آپ کے دین سے ڈراتے رہے حتیٰ کہ میں نے آپ کی باتیں نہ سننے کا تہیہ کر لیا اور اپنے کان روئی سے بند کر لئے تاکہ کہیں آپ کی کوئی بات میرے کانوں میں نہ پڑ جائے لیکن یہ اللہ کی مرضی تھی کہ اس نے مجھے آپ کی باتیں سنائیں اور وہ مجھے بہت پسند آئیں۔ آپ اپنا دین مجھے بتایئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت میرے سامنے پیش کی اور مجھے دو سورتیں، سورۂ اخلاص اور سورۂ فلق پڑھ کر سنائیں۔ خدا کی قسم اس سے پہلے میں نے اس کلام سے بہتر کوئی کلام نہیں سنا تھا نہ ان کی باتوں سے بہتر کوئی بات دیکھی تھی۔ میں نے اسی وقت اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔"

حضرت طفیلؓ اب داستان کے اس موڑ سے آگے بڑھتے ہیں۔

"پھر میں بہت دنوں تک مکے میں ٹھیرا رہا۔ اس مدت میں میں نے اسلام کی تعلیمات کو حاصل کیا اور جتنا ممکن ہوا قرآن حفظ کیا۔ پھر جب میں نے اپنے قبیلے کی طرف لوٹنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ میں اپنی قوم کا سردار ہوں۔ وہاں میری باتیں مانی جاتی ہیں، اب میں واپس جا کر انھیں اسلام کی دعوت دینا چاہتا ہوں۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ وہ مجھے کوئی ایسی نشانی عطا فرما دے جو میری دعوت کے لئے مدد و معاون ثابت ہو۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی "اللھم اجعل له آیه" خدایا طفیل کو کوئی نشانی مرحمت فرما دے"۔ اس کے بعد میں اپنے قبیلے کی طرف چل پڑا، یہاں تک کہ جب میں ان کی بستی کے قریب ایک اونچی جگہ پہنچا تو میری دونوں آنکھوں کے درمیان چراغ جیسی ایک روشنی پیدا ہو گئی۔ یہ دیکھ کر میں نے دعا کی کہ خدایا! اس کو چہرے کے علاوہ کسی دوسری جگہ منتقل کر دے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اس کو دیکھ کر سمجھیں گے کہ یہ کوئی سزا ہے جو مجھے اپنے آبا و اجداد کا دین چھوڑنے کے جرم میں ملی ہے۔ تب وہ روشنی وہاں سے منتقل ہو کر میری لاٹھی کے سرے پر آ گئی۔ اور جب میں پہاڑ

کی بلندی سے نیچے اتر رہا تھا تو میری لاٹھی کے سرے پر چمکتی ہوئی وہ روشنی لوگوں کو ایک معلق قندیل کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جب نیچے اتر کر اپنے قبیلے میں پہنچا تو میرے والد صاحب جو بہت ضعیف ہو چکے تھے، میرے پاس آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ "ابا! مجھ سے پرے ہٹیے۔ اب آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ نہ میں آپ کا ہوں نہ آپ میرے۔"

"بیٹے! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" والد صاحب نے کہا۔

"میں مسلمان ہو چکا ہوں اور میں نے محمدؐ کے دین کی پیروی اختیار کر لی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بیٹے! تم نے جو دین اختیار کیا ہے میں بھی اس کو اپناتا ہوں۔" انھوں نے فرمایا۔

"تب آپ جا کر پہلے غسل کر لیجئے اور اپنے کپڑے پاک کر کے تشریف لایئے تاکہ میں آپ کو وہ دین سکھا دوں جس کو میں نے اختیار کیا ہے۔" میں نے عرض کیا۔

پھر وہ اٹھے، جا کر غسل کیا اور اپنے کپڑے پاک کر کے میرے پاس آئے۔ میں نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی اور انھوں نے خوشی سے قبول کر لیا۔

پھر میری بیوی میرے پاس آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ "مجھ سے دور ہو۔ اب میرا اور تمھارا کوئی تعلق نہیں۔"

"میرے والدین آپ پر فدا ہوں، یہ کیوں؟" اس نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

میں نے کہا کہ اسلام نے میرے اور تمھارے درمیان جدائی کی وسیع خلیج حائل کر دی ہے میں نے اسلام قبول کر کے دینِ محمدؐ کی پیروی اختیار کر لی ہے۔"

اس نے کہا کہ "جو دین آپ کا ہے وہی دین میرا بھی ہے۔"

میں نے اس سے کہا کہ "جاؤ، جا کر ذوشریٰ کے چشمے میں غسل کر کے پاک ہو لو" (ذوشریٰ قبیلہ دوس کے بت کا نام تھا جس کے پاس وہ چشمہ تھا جو پہاڑ کی بلندی سے گرتا تھا) اُس نے کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ کیا آپ کو ذوشریٰ کی طرف سے بچوں کو کسی نقصان کا اندیشہ نہیں کہ مجھے اُس چشمے میں غسل کرنے کے لئے بھیج رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ تباہی ہو تمھاری اور ذوشریٰ کی۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ لوگوں کی نظروں سے دور جا کر وہاں غسل کر لو۔ میں تم کو اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ وہ حقیر بے جان پتھر تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

کے ساتھ خیبر کے مال غنیمت میں سے ہم لوگوں کو بھی حصہ عنایت فرمایا۔ ہم نے عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسول، آپ ہم لوگوں کو ہر غزوہ میں اپنے لشکر کے میمنہ پر مقرر فرمائیے اور ہمارا شعار "مبرور" مقرر فرما دیجئے۔"

حضرت طفیلؓ اپنی داستان کے آخری حصے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اس کے بعد میں برابر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ پر فتح عنایت فرمائی۔ فتح مکہ کے بعد میں نے بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول آپ مجھے عمرو ابن حمہ کے بت ذوالکفین کو جلانے کی مہم پر بھیج دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس کی اجازت دے دی۔ میں اپنے قبیلے کا ایک دستہ لے کر روانہ ہوا، جب اس کے پاس پہنچ کر اسے نذر آتش کرنا چاہا تو بہت سے مرد عورتیں اور بچے میرے گرد جمع ہوگئے۔ وہ اس بات کے منتظر تھے کہ اگر میں نے ذوالکفین کو کوئی نقصان پہنچایا تو آسمان سے بجلی گر کر مجھے ہلاک کر دے گی، لیکن میں اس کے پرستاروں کے سامنے ہی اس کی طرف بڑھا اور یہ کہتے ہوئے اس کو نذر آتش کر دیا۔

یَا ذَا الْکَفَّیْنِ لَسْتُ مِنْ عُبَّادِکَا	ذوالکفین میں تیرے پرستاروں میں سے نہیں ہوں
مِیْلَادُنَا اَقْدَمُ مِنْ مِیْلَادِکَا	ہماری پیدائش تیری پیدائش سے مقدم ہے
اِنِّیْ حَشَوْتُ النَّارَ فِیْ فُؤَادِکَا	میں نے تیرے دل میں آگ بھر دی ہے۔

اور اس بت کے آگ میں بھسم ہو جانے کے ساتھ ہی قبیلہ دوس میں شرک کے باقی ماندہ آثار بھی جل کر خاکستر ہوگئے۔ اور پورا قبیلہ مشرف بہ اسلام ہوگیا۔

حضرت عمرو بن طفیل رضی اللہ عنہ اس کے بعد ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے یہاں تک کہ آپ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے، اور جب آپؐ کے رفیق حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت طفیلؓ بن عمرو نے اپنے آپ کو اپنی تلوار کو اور اپنے لڑکے کو خلیفہ کی اطاعت کے لئے وقف کر دیا۔ اور جب مرتدین اور مدعیان نبوت کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ مسیلمہ کذاب سے جنگ کے لئے جانے والی فوج کے ہراول میں شامل ہوگئے۔ یمامہ جاتے ہوئے راستے میں انھوں نے ایک خواب دیکھا۔ انھوں نے اپنے رفقاء سفر سے کہا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے تم اس کی تعبیر بیان کرو، ساتھیوں نے

اس کے بعد وہ گئی، غسل کیا اور پھر میرے پاس آئی تو میں نے اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی جس کو اس نے بلا چون وچرا قبول کر لیا۔ پھر میں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، مگر ابوہریرہ کے سوا سب نے اس کو قبول کرنے میں دیر کی۔ حضرت طفیلؓ اس دلچسپ کہانی کو نئے موڑ پر لاتے ہیں۔

پھر میں ابوہریرہ کو ساتھ لے کر مکہ آیا، جب بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت فرمایا۔

"طفیل تمھارے پیچھے تمھارے قبیلے کا کیا حال ہے؟" میں نے عرض کیا کہ "ان کے دلوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں جو حق کے دیدار میں مانع ہیں۔ وہ لوگ کفر شدید میں مبتلا ہیں ان کے اوپر سرکشی اور نافرمانی کی کیفیت مسلط ہے۔" یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر آپ نے وضو کیا اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے۔

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ آپ کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ آپ میرے قبیلے والوں کے حق میں بددعا فرمائیں گے اور وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے ـــ تو بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ "آہ میری قوم" لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بددعا کرنے کے بجائے کہہ رہے تھے:

اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا . . . . اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا . . . . اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا .

خدایا قبیلۂ دوس کو ہدایت دے . . . . خدایا . . . . خدایا . . . .

پھر آپؐ نے طفیل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا کہ "اپنے قبیلے میں جاؤ، ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرو۔"

پھر میں مستقل طور پر قبیلۂ دوس کے علاقے میں رہ کر انھیں اسلام کی طرف دعوت دیتا رہا حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور یکے بعد دیگرے بدر، احد اور خندق کے معرکے گذر گئے۔ اور جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت میرے ساتھ قبیلہ دوس کے اسی گھرانے تھے جو اسلام قبول کر کے اس کی تعلیمات آراستہ ہو چکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے اور مسلمانوں

خواب کی تفصیل دریافت کی۔ انھوں نے کہا کہ "میں نے دیکھا کہ میرا سر مونڈ دیا گیا ہے، میرے منہ سے ایک پرندہ نکلا، ایک عورت نے مجھے اپنے پیٹ میں داخل کر لیا اور یہ کہ میرا بیٹا عمرو بڑی تیز رفتار سے میرے پیچھے آ رہا ہے مگر میرے اور اس کے درمیان ایک رکاوٹ کھڑی کر دی گئی اور وہ میرے ساتھ اس میں داخل ہونے سے رہ گیا۔"

ساتھیوں نے کہا آپ کا یہ خواب بہت اچھا ہے۔ حضرت طفیل نے کہا کہ میں نے اپنے طور پر اس خواب کی یہ تعبیر کی ہے۔

"سر مونڈے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کاٹا جائے گا، اور پرندہ جو منہ کے راستے سے نکلا تو اس سے مراد میری روح ہے، اور عورت جس نے مجھے اپنے پیٹ میں داخل کیا، اس سے مراد میری قبر ہے جس میں میں دفن کیا جاؤں گا۔ یہ ہے کہ مجھے شہادت نصیب ہوگی، اور میرے بیٹے کے میرا پیچھا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ بھی شہادت کی طلب میں میرا ساتھ دیگا مگر وہ اسے کچھ دنوں کے بعد حاصل کر سکے گا۔"

معرکہ یمامہ میں صحابی جلیل حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے زبردست داد شجاعت دی یہاں تک کہ وہ زخمی ہو کر گر گئے، اور زخموں کی تاب نہ لا کر نعمت شہادت سے بہرہ ور ہوئے مگر ان کے صاحبزادے عمرو بن طفیل برابر جنگ میں مصروف رہے یہاں تک کہ زخموں سے نڈھال ہو گئے اور ان کا دایاں ہاتھ کٹ کر گر گیا۔ اور وہ اپنے والد اور اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو یمامہ کی سرزمین پر چھوڑ کر مدینہ واپس آ گئے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایک بار حضرت عمرو بن طفیل ان کی خدمت میں باریاب ہوئے، اسی وقت حضرت عمرؓ کے لئے کھانا لایا گیا۔ مجلس میں کچھ اور لوگ بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے سب کو کھانے کے لئے بلایا۔ مگر حضرت عمرو بن طفیل کھانے میں شریک نہیں ہوئے، وہ کنارے ہٹ گئے تھے، حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے تم کھانے میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟ شاید تم اپنے کٹے ہوئے ہاتھ پر ندامت محسوس کر رہے ہو اور کھانے میں شریک ہونے سے جھجکتے ہو۔ انھوں نے کہا، جی ہاں امیرالمومنین! یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم جب تک تم اپنا کٹا ہوا ہاتھ اس کھانے میں نہیں ڈالو گے میں اس کو چکھ نہیں سکتا

خدا کی قسم! اس مجلس میں تمہارے سوا کوئی نہیں ہے جس کا کوئی عضو جنت میں ہو۔"

حضرت عمرو بن طفیلؓ جب سے اپنے والد محترم سے جدا ہوئے تھے، برابر اس خواب کی عملی تعبیر کی جستجو میں لگے رہے، یہاں تک کہ جب جنگ یرموک کا موقع آیا تو اس میں بڑے شوق سے شریک ہوئے۔ اور بڑی بے جگری سے لڑے یہاں تک کہ اس دولت شہادت سے سرفراز ہو گئے جس کی تمنا ان کے والد نے ان کے دل میں پیدا کی تھی۔ اللہ تعالیٰ عمرو بن طفیل دوسی رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے۔ وہ شہید ہیں اور شہید کے باپ ہیں۔

(بقیہ : جامعۃ الفلاح کا خواب)

ور لڑکے سے لڑکی زمین موڑ پر جامعہ کی آبادی کرتے تھے لیکن ایک وقت آیا کہ موت کے فرشتے نے انھیں آ گھیرا، اور وہ اب ہمارے درمیان نہ رہے اور اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ انکو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی جامعہ سے متعلق قربانیوں کو قبول فرمائے اور جامعہ کے اس خلا کو جلد ہی پر کرے۔ کل من علیہا فان۔

(بقیہ متاع آخر شب)

"متاع آخر شب" کے صفحہ پر یہ شعر درج ہے:

تو جوہری ہے تو زیبا نہیں تجھے یہ گریز — مجھے پرکھ، مری شہرت کا انتظار نہ کر

یہ شعر اپنے اندر کس درجہ حقیقت و صداقت کی تلخی لئے ہوئے ہے۔ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حاصل گفتگو یہ ہے کہ "متاع آخر شب" تعمیر پسند ادب میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہر اعتبار اس قابل ہے کہ اسے خرید کر لائبریریوں اور کتب خانوں کی زینت میں اضافہ کیا جائے۔

آخر میں میں حفیظ صاحب ہی کا ایک شعر ان کے تذکرے کے سلسلہ گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔

آپ کا دم بھی غنیمت نظر آتا ہے حفیظ — رہ گئے ہیں بھلا اب ایسے قلندر کتنے

(بقیہ جامعہ کے لیل و نہار)

گولڈ میڈل جامعہ ملیہ اسلامیہ میں امسال جامعہ کے ذیل فلاحی برادران نے تعلیمی لحاظ سے نمایاں کامیابی پر گولڈ میڈل حاصل کیا۔

محمد خالد حامدی فلاحی — ایم اے میں پہلی پوزیشن آنے پر خاص طور پر گولڈ میڈل حاصل کیا

ابوالکلام فلاحی — " " " " " " " "

طارق مسلم فلاحی — بی اے میں " " " "

معین الدین فلاحی

شہاب الدین، ریسرچ اسکالر (شعبۂ اردو)
اے ایم یو علی گڑھ

موازنۂ انیس و دبیر پر ایک نظر

"موازنۂ انیس و دبیر" اردو کی وہ تنقیدی کتاب ہے جس سے ہمارے ادب میں علمی تنقید کی داغ بیل پڑی۔ "موازنہ" کی اہمیت صرف اسی میں مضمر نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس میں پہلی بار صنف مرثیہ پر "تاریخی و تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے دو باکمال مرثیہ نگاروں کے کلام کا تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ "موازنہ" کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا، اور شبلی کا شمار اردو کے صف اول کے ناقدین میں ہونے لگا۔ شبلی اردو شاعری کے متعلق اپنے زمانے کے انگریزی خوانوں کے اس خیال کی تردید کرنا چاہتے تھے کہ "اردو شاعری میں زلف و خال و خط، یا ہجو و خوشامد اور مداحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے"۔ اسی مقصد کے تحت یہ عظیم بالشان کارنامہ وجود میں آیا۔ شبلی کے الفاظ میں "موازنہ" لکھنے کا اصل مقصد یہ تھا۔

"اس بنا پر مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مایگی زبان، کیا پایہ رکھتی ہے اس غرض کے لئے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔"[۲]

"موازنۂ انیس و دبیر" کا آغاز مرثیہ کی مختصر تاریخ سے ہوتا ہے، اس کے بعد شاعری کے مختلف محاسن کا جائزہ الگ الگ عنوانات کے تحت کیا گیا ہے۔ میر انیس کی شاعرانہ خصوصیات کے ضمن میں فصاحت و بلاغت کی تعریف، روزمرہ و محاورہ، تجربوں کا انتخاب، لفظوں کا محل انتخاب، بندش کی چستی، تشبیہات و استعارات، انسانی جذبات و احساسات، منظر نگاری، واقعہ نگاری، کردار نگاری اور رزمیہ و بزمیہ شاعری پر مفصل بحث کی گئی ہے اور کثرت سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ "موازنہ" کو مکمل تنقیدی کتاب بنانے کے لئے ایک باب میں میر انیس کے کلام

اعتراضات بھی کئے گئے ہیں۔ در آخر میں انیس و دبیر کے قریب المثل استعاد کے فنی محاسن کا جائزہ لیتے ہوئے دونوں کا موازنہ کیا گیا ہے۔ اس طرح شبلی نے صنف مرثیہ کی تاریخ اس کے دائرۂ اثر اور اس کی حد کے ساتھ ساتھ انیس و دبیر کے شاعرانہ کمالات سے بھی ادبی دنیا کو روشناس کرایا۔ "موازنہ" سے قبل "آب حیات" اور "مقدمہ شعر و شاعری" میں بھی مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کا مختصر ذکر ملتا ہے لیکن یہ شبلی کے قلم کا اعجاز تھا کہ انھوں نے صنف مرثیہ کے مختلف ادبی پہلوؤں کو اجاگر کر کے اس کو دیگر اصناف کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کر دیا، اور دنیائے علم و ادب کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ چنانچہ موازنہ کی اشاعت کے بعد متعدد رسالے اور کتابیں اس کے جواب میں لکھی گئیں جن میں "ردالموازنہ"، "تردید موازنہ" اور "المیزان" کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں "المیزان" دوسری کتابوں کی بہ نسبت تفصیلی بھی ہے اور کچھ نہ کچھ علمی انداز کی بھی حامل ہے۔ جہاں تک دوسری کتابوں کا معاملہ ہے وہ تو کب کے دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکیں، اور تاریخوں میں ان کے نام صرف اس لئے محفوظ رہ گئے کہ وہ موازنہ کے جواب میں لکھی گئی تھیں۔ مصنف المیزان نے "موازنہ" کے ہر عنوان پر تنقیدی نظر ڈالی ہے، اور ان کے نزدیک موازنہ میں جو کمزوریاں اور خامیاں ہیں ان کی طرف واضح اشارے کئے ہیں۔ علاوہ بریں مرزا دبیر کے کلام سے وافر مثالیں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ مرزا دبیر میر انیس سے کسی طرح کم درجے کے شاعر نہیں، دبیر کے یہاں بھی وہ تمام شعری محاسن ملتے ہیں جن کو شبلی نے انیس کا طرۂ امتیاز قرار دیا ہے۔ اس لئے صاحب "المیزان" کے خیال میں ان دونوں باکمالوں میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی نیز یہ کہ شبلی نے دبیر پر انیس کو فوقیت دے کر ناانصافی کی ہے۔

چودھری نظیر حسین فوق صاحب المیزان نے شبلی پر جو فرد جرم عائد کی ہے وہ بڑی سنگین ہے، اپنی "فرد جرم" کے پیوست کنندہ حالات واضح کرنے کے لئے انھوں نے ۶۱۰ صفحات کی ضخیم کتاب تحریر فرمائی ہے، لیکن جب ہم ان کے فرمودات کا علامہ شبلی کی تحریروں سے باہمی مقابلہ و موازنہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ چودھری صاحب الفاظ کے طوطا مینا اڑاتے ہیں۔ ان کو شبلی کے کسی نہ کسی لفظ پر گرفت کر کے ان سے ہر حال اختلاف کرنا ہے مصنف کی یہ روش کتاب کے پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک قائم ہے۔ حتیٰ کہ خود کو غیر جانبدار

قرار دیئے گئے ہیں۔ اعلان فرماتے ہیں کہ وہ انیس سے شبلی کے مقابلے میں بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ گے۔ ہاتھوں وہ یہ کہتے سے بھی نہیں چوکتے "کہ شبلی نے دبیر جیسے عابد، زاہد، مداح اہل بیت کی شان میں گستاخی کی ہے" مگر یہ نہیں بتلاتے کہ شبلی کے کن الفاظ سے گستاخی کا پہلو نکلتا ہے فصاحت و بلاغت کا پہلو ہو، یا واقعہ نگاری کی مجبوروں کے انتخاب کا معاملہ ہو یا تشبیہات و استعارات کا، شبلی کے قائم کردہ ہر عنوان سے چودھری صاحب اختلاف کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اور ان کو شبلی کی کوئی بات سیدھی نہیں نظر آتی۔ شبلی نے اگر موازنہ لکھنے کے بجائے صرف انیس کے محاسن کلام سے بحث کی ہوتی، اور ان کا موازنہ دبیر سے نہ کیا ہوتا تو ہمارے خیال میں ان پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ خود چودھری صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ شبلی اگر صرف انیس کے کلام پر کتاب لکھتے تو انیسیئے ہی نہیں معتقد مرزا دبیر بھی خوش ہوتے۔ ہمارے خیال میں شبلی نے "موازنہ" کسی کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ اردو میں عملی تنقید کی بنیاد ڈالنے کے لئے لکھی تھی، چونکہ یہ ایک نئی چیز تھی، اس لئے اس کی مخالفت ہوئی اور خوب ہوئی۔ "المیزان" کا شہرہ بھی وقتی ثابت ہوا۔ شبلی کی کتاب "موازنہ انیس و دبیر" آج بھی پڑھی جاتی ہے اور بازار میں اس کے لاتعداد نسخے مل جاتے ہیں مگر "المیزان" کو لوگ بھول چکے، اور اگر کبھی اس کا ذکر بھی آتا ہے تو اس عنوان سے کہ یہ کتاب شبلی کی کتاب سے اختلاف کرتے ہوئے لکھی گئی تھی۔

افسوس ہے کہ "تردید موازنہ" ہم کو دستیاب نہ ہو سکی اس لئے ہم یہ کہنے سے قاصر ہیں کہ وہ کن کن "لطائف وظرائف" سے پُر ہے۔ "ردالموازنہ" البتہ ہماری دسترس میں ہے[۲]۔ بہتر صفحات کی بڑی تقطیع کی یہ کتاب لکھنؤ سے شائع ہو گئی تھی۔ کتاب پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے، کتاب میں جو چار منظوم تاریخیں آخر میں درج ہیں ان میں تین سے ۱۳۲۶ھ برآمد ہوتا ہے، اور ایک سے ۱۳۲۵ھ اس لئے یہ کتاب ان دونوں سنین کے درمیان لکھی گئی ہوگی اس کتاب کے مصنف، نقل علی صفدر ہیں جو لکھنؤ کے محلہ کاظمین کے رہنے والے تھے۔ اس کتاب کو اول سے آخر تک پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ شبلی کا مولد، دہلی [illegible] لکھنؤ، [illegible] صاحب ردالموازنہ کے نزدیک ان کی تحریر یا زبان اعتبار کو نہیں پہنچ سکی تھی اس کتاب میں جس انداز تنگ دشت کو تنقید کا نام دیا گیا ہے وہ تو اپنی موت آپ مرچکا ہے، البتہ اگر کبھی [illegible]

تنقیدی روش کی کوئی تاریخ مرتب کرنی ہو تو "ردالموازنہ" اس کے لئے بنیادی مواد کا کام دے گی۔

سید افضل حسین ثابت کی "حیات دبیر" موازنہ انیس و دبیر کے رد میں تو نہیں لکھی گئی تاہم انھوں نے چند مقامات پر موازنہ کے بعض خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے شبلی پر جو فرد جرم عائد کی ہے وہ کچھ یوں ہے۔ انھوں نے شبلی کے افکار و خیالات کو نا واقفیت اور ناسمجھی سے داغدار بتلایا ہے۔ اور اپنی دانست میں اس کی بہت سی مثالیں دے کر شبلی کے ہر خیال کو غلط ٹھہرایا ایسا تو نہیں ہے کہ شبلی کی ہر بات سو فیصد سچ ہو، کیونکہ شعر کی تشریح، توجیہہ، و تعبیر میں اختلاف کی گنجائش رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں ہے کہ شبلی نے کلام دبیر پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ سب کے سب یکسر غلط ہیں، اصل معاملہ یہ ہے کہ جس وقت موازنہ کی رد میں دوسری کتابیں لکھی گئی تھیں، اس وقت کی لکھنؤ کی ادبی دنیا دو واضح گروہوں میں تقسیم تھی، انیسیوں کو دبیر کی خوبی نظر نہ آتی تھی اور دبیریوں کو انیس کی۔ موازنہ میں چونکہ شبلی نے دبیر کے مقابلے میں انیس کی شاعری کو سراہا ہے اور دبیر کے مقابلے میں انیس کو بڑا ہی نہیں بہت بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔ اس لئے ان کو انیسیہ سمجھا گیا، موازنہ کے جواب میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں وہ سب کی سب دبیریوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور اس طرح کی جو کتابیں سامنے آئیں ان میں "حیات دبیر" میں ایک بات یہ ضرور مشترک ہے کہ ہر کتاب کے مصنف نے لکھنؤ کے شعراء کی زبان پر کس طرح انگلی رکھی تھی۔ ان کو تو زعم یہ ہے کہ اہل لکھنؤ یا اہل دہلی ہی زبان کے لحاظ سے واقعتاً اور حقیقتاً "عرب" ہیں، ہندوستان کے دوسرے حصوں میں رہنے والے تو ان "عربوں" کے سامنے اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتے جو زمانہ جاہلیت کے عجمی عربوں کے سامنے رکھتے تھے، موازنہ سے پہلے شبلی کے قلم سے جتنی بھی تحریریں نکلیں ان کو اہالیان ملک نے ہاتھوں ہاتھ لیا، اور ان کی زبان دانی پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ کیا گیا، لیکن موازنہ کے شائع ہوتے ہی شبلی کا سارا علم و فضل، ادب و انشاء، صرف غلط کی طرح مٹ گئے۔"

شبلی پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ انھوں نے دبیر کے غلط اشعار نقل کئے اور ایسے سارے اشعار بھی انھی کے نامہ اعمال میں داخل کرکے ان پر اعتراضات کئے، ہم کو اس بات کے ماننے میں کوئی تامل نہیں کہ شبلی نے سہواً دبیر کے غلط اشعار لکھے ہیں، لیکن اس کی وجہ وہی ہے جو خود

صاحب حیات دبیر نے لکھی ہے وہ یہی کہ شبلی نے مطبع نولکشور کے مطبوعہ نسخہ کو اپنے سامنے رکھا، اور اس سے اشعار نقل کئے۔ جس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہوئی۔ اس سلسلے میں شبلی کی مجبوری یہ تھی کہ ان کے پاس مراثی کے مخطوطات نہ تھے، جن کے باہمی موازنہ و مقابلہ سے وہ درست متن متعین کرتے اور پھر اس کو موازنہ میں درج کرتے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کسی محقق متتبع نے مطبع نولکشور کے مطبوعہ مراثی دبیر پر نہ کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی اس بات کی کوشش کی کہ دبیر کے کلام کا متن درست ہو جائے۔ مگر جب شبلی نے مطبوعہ مجموعے سے اشعار نقل کئے تو ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ دبیر کو ختم کرنے کی مہم چلانے ہوئے ہیں۔ شبلی کی "موازنۂ انیس و دبیر" صاحب حیات دبیر کی نگاہوں میں کیا وقعت رکھتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف ان کا ایک اقتباس پڑھ لینا کافی ہوگا۔

"یہ بات بھی قابل تحریر ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی کتاب کا نام تو موازنۂ انیس و دبیر رکھا ہے اور ۲۸۵ صفحے کی وہ کتاب ہے پندرہ سولہ صفحے مرثیہ گوئی کی تاریخ لکھنے میں صرف فرمائے ہیں۔ باقی قریباً دو سو صفحے کلام میر انیس مرحوم کی تنقید و مدح و ذم ہے۔ مرزا دبیر مغفور کے کلام کے واسطے فقط پندرہ سولہ ورق صرف کئے ہیں، اور اکثر وہ کلام لکھا ہے جو ان کے نزدیک قابل قدح ہے۔ کیوں انصاف پسند ناظرین! کیا موازنہ کی یہی شان ہے اور اس کتاب کو موازنہ کہہ سکتے ہیں۔ مرزا دبیر جن کی مطبوعہ بیس جلدیں اور اسی قدر غیر مطبوعہ بتائی جاتی ہیں ان کا کلام تو پندرہ سولہ ورق میں لکھا جائے۔ اور میر انیس مرحوم کے واسطے دو سو صفحہ وقف کئے جائیں اور جن کی تصنیف مطبوعہ پانچ چھ جلدوں سے زیادہ نہیں ہے کیا یہی انصاف ہے۔ میں کہتا ہوں بفرض محال اگر کل کلام دبیر سست ہو جو موازنہ میں بھی پست ہو جب بھی تو ملا دبیر میں فرق نہیں آسکتا کیونکہ وہ کلام تو کل کلام کا ½ حصہ بھی نہیں ہے اگر کسی شاعر کے ۹۹ شعر اچھے ہیں اور ایک سست ہے تو کیا وہ شاعر قابل قدح ہے؟ ہرگز نہیں یہ مولوی صاحب کا انصاف قابل غور و انصاف ہے؟" [۵]

یہاں بھی جذبہ ہی کا دخل ہے کہ اگر شبلی کو مرثیہ پر کچھ لکھنا ہی تھا تو وہ صرف انیس کے کلام پر

ایک کتاب لکھ دیتے، دبیر کو درمیان میں کیوں لائے؟ موازنہ اب سے لگ بھگ اسی برس پہلے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کو لکھنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ علم و ادب کی دنیا میں ایک ہلچل پیدا ہو۔ اسی لئے شبلی نے ایک ٹھہرے ہوئے تالاب میں اس زور سے پتھر پھینکا کہ اس کی لہریں آج تک جوار بھاٹا بنی ہوئی ہیں۔

موازنہ کے دور تصنیف سے لے کر آج تک برابر موازنہ پر کچھ نہ کچھ لکھا جاتا رہا ہے۔ جب بھی کوئی ناقد اردو تنقید کی تاریخ پر قلم اٹھاتا ہے، صنف مرثیہ کی تاریخ مرتب کرتا ہے یا کسی مرثیہ گو کے حیات و ادبی آثار کو اپنی تحقیق کا موضوع بناتا ہے تو شبلی کا موازنہ ضرور زیر بحث آتا ہے۔ خواہ اس سے اتفاق کیا جائے خواہ اختلاف۔ خود ہمارے عہد میں موازنہ کی مخالفت یا موافقت میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اگر ان سب کو یکجا کر دیا جائے تو بلا مبالغہ جہازی سائز کی کئی ضخیم جلدیں مرتب ہو جائیں گی۔ موازنہ شائع ہونے کے بعد ہی جو رد عمل ظاہر ہوئے تھے وہ دو طرح کے تھے، ایک انتہا پسندانہ اور دوسرے ہمدردانہ۔ انتہا پسندانہ رد عمل کے طور پر جو مقالے یا کتابیں لکھی گئیں ان کی خصوصیت یہ ہے کہ شبلی کو ایک سراپا مجرم بنا کر پیش کیا گیا ان کی زبان، شخصیت، قومیت، خواتین سے ان کا اختلاط غرض کہ ہر بات کا نازیبا الفاظ میں چٹخارے لے لے کر ذکر کیا گیا۔ ہمدردانہ رد عمل میں جو چیزیں منظر عام پر آئیں ان میں شبلی کو غلطیوں سے پاک تو نہیں قرار دیا گیا مگر یہ ضرور دکھایا گیا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے ایسا کیوں لکھا ہے؟ اور اگر ضرورت سمجھی گئی ہے تو شبلی کی تنقیدی آرا سے اختلاف بھی کیا گیا ہے۔ شبلی کی ذات اور شخصیت کا اندازہ نہیں لگایا گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی یہ دونوں نقطۂ نظر باقی ہیں۔ ہمارے نزدیک میر عابد علی عابد انتہا پسندانہ اور سید احتشام حسین ہمدردانہ دو متوازن نقطۂ نظر سے موازنہ پر نظر ڈالتے ہوئے عہد حاضر میں اس کی معنویت اور اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۹۶۴ء میں سید عابد علی عابد نے موازنہ کا ایک انتقادی متن تیار کر کے اس پر ایک طویل مقدمہ لکھ کر مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کروایا۔ اس مقدمہ کا تقریباً پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ "رد الموازنہ" کے جذبات و احساسات کو آج کی مصطلحات الفاظ اور انداز بیان

میں سپرد قلم کر دیا گیا ہے۔ سید عابد کو بھی موازنہ میں کوئی خوبی نظر نہیں آئی نہ ہی شبلی کی اس اولیت کے قائل ہیں کہ انھوں نے اردو میں عملی تنقید کی داغ بیل ڈالی اور آج کی عملی تنقید شبلی ہی کے دکھائے ہوئے راستے پر گامزن ہے۔ سید عابد علی عابد نے شبلی پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ ایک بات کو پکڑ لیتے ہیں اور اسی کی خواہ مخواہ پچ کرتے ہیں۔[۱۱] شبلی نے میر انیس کے کلام پر جو اعتراضات کئے ہیں انکو عابد علی عابد صاحب "نام نہاد و غیر جانب داری" کا نام دے کر ایک طرح سے شبلی کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ دوسرے ناقدین نے تو شبلی کی بہت سی باتوں سے اختلاف کرنے کے باوجود ان کی کتاب کے بعض گوشوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ مگر سید عابد علی عابد صاحب کو شبلی کی نہ صرف اس تحریر میں بلکہ کسی تحریر میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ ان کے تیر سے نہ تو الفاروق بچی اور نہ المامون حتیٰ یہ کہ وہ شعر العجم کو بھی نگاہ تخفیف سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے شبلی پر لگانے کو تو یہ الزام لگا دیا کہ وہ بات کو پکڑ لیتے ہیں اور اسی کی پچ کرتے ہیں۔ یہ بات موازنہ پر تو بہت کم مگر خود عابد علی کی تحریر پر ضرور صادق آتی ہے کیونکہ ان کو موازنہ ہر خوبی اور حسن سے عاری نظر آتا ہے۔ ہمارے خیال میں عابد علی عابد کے خیالات "المیزان" "تردید موازنہ" اور "رد الموازنہ" کے خیالات کی توسیع و تشریح ہیں اور کچھ نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ تمام باتیں ہمارے عہد کی زبان میں لکھی گئی ہیں۔

ہمارے نزدیک موازنہ انیس و دبیر پر سب سے بھرپور اور متوازن محاکمہ پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے کیا ہے۔ احتشام صاحب کا قیاس ہے اور غالباً صحیح قیاس ہے کہ شبلی کی نگاہیں اردو شاعری میں محاسن کی قسم کی چیزوں کی تلاش میں تھیں۔ ان کو محاسن کا سارا رنگ و آہنگ انیس کی مرثیہ نگاری میں نظر آیا اس لئے انھوں نے انیس کے محاسن شعری کو اپنی دلکش اور پرجوش زبان میں اجاگر کرنے کے لئے موازنہ تصنیف کی۔[۱۲] تمہید کے طور پر انھوں نے مرثیہ نگاری کی تاریخ کا جائزہ لیا جو ان کی کتاب میں اصل موضوع نہیں بلکہ مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لئے موازنہ کا یہ حصہ بہت سے لوگوں کو تشنہ نظر آتا ہے اور بات بھی یہی ہے کہ جو چیز تفصیل سے بیان کرنے کی تھی اس کو انھوں نے اجمال سے بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انیس کی شاعری پر کتاب لکھ رہے تھے، مرثیہ گوئی کی تاریخ پر نہیں۔ احتشام صاحب کی یہ بات بھی دل کو لگتی ہے کہ شبلی جن شاعرانہ خصوصیات کو اہمیت دیتے تھے ان کے مناسب ترین نمونے انھیں انیس ہی کے کلام میں

نظر آتے تھے

احتشام صاحب نے اپنی ساری بحث کا نچوڑ درج ذیل چند جملوں میں سپرد قلم کر دیا ہے۔ جو یہ ہے۔

"اگر یہ کتاب زیادہ غور و فکر سے لکھی گئی ہوتی، ابواب کی ترتیب و تنظیم بہتر ہوتی محض مثالوں کے سہارے خصوصیات کو واضح کرنے کی کوشش کے بجائے تنقیدی تجزیے سے بھی کام لیا گیا ہوتا، مرثیہ نگاری کا جائزہ بحیثیت فن کے لیا جاتا، اور انیس و دبیر کے تقابلی مطالعہ کو زیادہ اور بھرپور شکل میں پیش کیا گیا ہوتا، اصول شاعری کے متعلق جو مباحث چھیڑے گئے تھے ان پر زیادہ منطقی اور استدلالی رنگ میں بحث کی گئی ہوتی تو موازنہ کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی لیکن اپنی موجودہ حالت میں بھی یہ تصنیف اردو تنقید کے ارتقا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔"[۱۳]

ہم کو احتشام صاحب کی رائے کے بڑے حصے سے نہ صرف اتفاق ہے بلکہ ہم ان کے رائے کو موازنہ کی اہمیت و معنویت سمجھنے کا بہترین ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ واقعی اگر شبلی نے انیس کا دبیر سے موازنہ اور بھرپور کیا ہوتا اشعار کا تنقیدی تجزیہ کر کے اپنی پسند و ناپسند کو ظاہر کیا ہوتا، تاریخ مرثیہ کے سلسلے میں اپنا مواد جمع کرتے وقت مزید تحقیق سے کام لیا ہوتا تو موازنہ کے جواب میں جو کتابیں معرض وجود میں آئیں ان کے لکھنے کی ضرورت نہ پیش آتی۔

موازنہ انیس و دبیر کے معترضوں اور نکتہ چینیوں نے جن آرا کا درشت اور دائرہ تہذیب سے خارج الفاظ میں اظہار کیا ہے اگر بفرض محال ان سب کو مثلاً لفظاً درست تسلیم کر لیا جائے تب بھی موازنہ کی اہمیت اس وجہ سے آج تک برقرار ہے کہ اسی کتاب کے ذریعے سے مرثیہ کی صنف کو شاعری کے دائرہ میں جگہ ملی۔ اس کتاب کے عالم وجود میں آنے سے پہلے اردو مراثی کا مطالعہ شعری نقطۂ نظر سے نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس کو ماتم و بین کا ایک ذریعہ اور حصول نجات کا ایک وسیلہ سمجھا جاتا تھا۔ موازنہ انیس و دبیر کی اشاعت سے قبل کسی بھی ادیب یا مصنف نے مرثیہ کی صنف کا اس لحاظ سے مطالعہ نہ کیا تھا کہ اس میں کون کون سے شعری اجزاء پائے جاتے ہیں، کس طرح جذبات کی عکاسی کی جاتی ہے، کرداروں کی زبان سے کس طرح حسب حال

مکالمے ملوائے جاتے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب میں کن کن چیزوں اور کن کن تقاضوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے
اس صنف سخن کے ذریعے کس طرح غیر شعوری طور پر شاعر اپنے ماحول، تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتا ہے
اس لحاظ سے موازنۂ انیس و دبیر اردو کی وہ پہلی کتاب کہلانے کی مستحق ہے جس نے صنف مرثیہ کو اردو کی
جمالیہ و رزمیہ شاعری کی محفل میں جگہ دی اور اس کے محاسن اسی نقطۂ نظر سے اجاگر کیے۔

شبلی کے بعد اردو مرثیہ نگاری پر جو بھی کام ہوا ہے ان سب میں شبلی کے خیالات کی صدائے بازگشت
ہر جگہ سنی جا سکتی ہے۔ شبلی کے بعض خیالات اور توجیہات سے خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کیا جائے
یہ مانے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ اردو مرثیہ نگاری پر کام کرنے کی راہ شبلی نے دکھائی ہے اور انہی کی دکھائی
ہوئی راہ پر چل کر آج ہم اس مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس صنف سخن پر جتنا بھی کام ہوتا جائے گا
شبلی کی اہمیت اور معنویت کے نئے نئے گوشے ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے جائیں گے۔

حواشی

۱۔ موازنۂ انیس و دبیر، مرتبہ ڈاکٹر مسیح الزماں، ۱۹۶۰ء ص ۱۹
۲۔ ایضاً ص ۲۰-۱۹
۳۔ المیزان، چودھری نظیر حسین شوق ص ۲
۴۔ ایضاً ص ۳
۵۔ ایضاً ص ۱۵۱
۶۔ ایضاً ص ۱۴
۷۔ ردِ موازنہ، میر افضل علی ضو ص ۱۳
۸۔ حیات دبیر، سید افضل حسین ثابت رضوی ۱۹۱۳ء ص ۷۵
۹۔ ایضاً ص ۶۲۴
۱۰۔ ایضاً ص ۶۲۳-۶۲۲
۱۱۔ مقدمہ، موازنۂ انیس و دبیر، مرتبہ سید عابد علی عابد ۱۹۶۴ء ص ۶۰
۱۲۔ عکس اور آئینے، سید احتشام حسین ۱۹۶۲ء ص ۱۶۷
۱۳۔ ایضاً ص ۱۶۸۔

دروزی کون ہیں؟

اخبارات اور اہل قلم کی معلومات کیلئے چند اہم تاریخی و تحقیقی پہلو

گذشتہ چند سالوں سے ہمارے اخبارات میں دروزیوں کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ لوگ
لبنان و شام کے علاقوں میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے اخبارات کچھ معلوم
کیے بغیر ان کو "دروزی مسلمان" لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کو کسی طرح مسلمانوں کا کوئی فرقہ قرار نہیں دیا جا
سکتا۔ یہ ایک پراسرار مذہبی گروہ (MYSTERIOUS RELGIOUS CULT) ہے۔ اس مضمون میں
ہم ان کے عقائد کا مختصر جائزہ لیں گے۔

اوراق تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں مسلمان عربوں نے جو فتوحات
کیں، اس کے نتیجے میں اسلام کی تبلیغ کے لیے [illegible] مسلمانوں
کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی اپنی صفوں میں نظر آتے ہیں جن کو [illegible]
تلوار کا بدلہ تلوار سے نہیں لے سکتے تھے، اس لئے انہوں نے قلم سے [illegible]
صوفی ازم سپر یوٹ لندن ایڈیشن) اور یہ جنگ ابھی تک جاری ہے۔ ایران، عراق، شام اور [illegible]
میں ایسی خفیہ تحریکیں وجود میں آئیں کہ جو بنیادی طور پر اسلام دشمن تنظیمیں تھیں۔ ان کے سیاسی عزائم
تھے مگر ان کا لبادہ مذہبی بلکہ متصوفانہ تھا۔ دوسری صدی ہجری میں بغداد ان تمام خرافات کا مرکز بن گیا
جو فلسفۂ الہیات کی آڑ لے کر وجود میں آئیں۔ مامون الرشید کے دربار پر بھی اثرات نمایاں تھے۔ ان تمام
باطنیوں اور منافقوں کا سرپرست بن گیا جو عوام میں تشکیک کا باعث بنا۔ یونانی، نصرانی، اسرائیلی
مجوسی، ایرانی اور ہندوستانی عقائد و نظریات نے اسلامی ادب کا روپ دھارنا شروع کر دیا۔
معتزلہ اور اخوان الصفا جیسے فلسفیوں نے تمام بنیادی عقائد کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

اول لارنس اور بلاوسکی (BLAVASTKY) دروزی ایک ایسا مذہبی گروہ ہے جس کے

عقائد کو دروز، باطنیوں اور دیگر مخفی عقائد کا ملغوبہ معلوم ہوتا ہے۔ دروزیوں پر ڈاکٹر ولسن اپنے WER (TIBET) کی کتاب "شامی مذاہب کی تحقیق" (Researches into the Religions of دروزیوں کے معتقدات کا ہے۔ مصنف نے اپنی تحقیق کے لئے شام اور لبنان میں عرصہ دراز تک قیام کیا اور خفیہ تعلیمات کا پتہ چلایا تھا۔ اس نے ان لوگوں سے گہرے مراسم پیدا کئے تھے۔ اس کے خیال میں عباسیوں کی ایران نوازی کے نتیجے میں شعوبیہ اور قرامطیوں کو اسلام کے خلاف کام کرنے کے لئے تمام آسانیاں میسر آگئی تھیں شعوبیہ تو عربوں سے اور عربی زبان سے شدید نفرت کرتے تھے اور عربوں کی برتری یا بالادستی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ قرامطی تحریک تو کھلی ہوئی سیاسی تحریک تھی۔ اس تحریک کی جڑیں نہ صرف ایران میں مضبوط تھیں بلکہ بعد کی صدیوں میں برصغیر کے ان علاقوں میں جو اب پاکستان میں شامل ہیں۔ ٹھٹھہ اور ملتان سب سے بڑا گڑھ تھا۔ ان ہی کی اسلام دشمن سازشوں کے خاتمے کے لئے غوری اور غزنوی نے بار بار حملے کئے تھے۔ جن کو انگریزوں نے لٹیرا کہہ کر بدنام کیا ہے۔ کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ اسلام کے دشمنوں نے سومنات کے مندر میں پناہ لے رکھی تھی۔ اسے دولت کے لئے فتح نہیں کیا گیا تھا۔

دوسری صدی ہجری میں دو ایرانی باشندوں نے جن کے نام حمزہ اور دروز تھے اس نئے مذہبی گروہ (CULT) کی بنیاد ڈالی۔ عجیب و غریب عقائد ایجاد کئے۔ یہ دونوں خود باطنی تھے اس لئے باطنیت کی جھلک ان کے عقائد پر اب بھی نظر آتی ہے۔ تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ ان کا شعوبیہ اور قرامطہ سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ انھوں نے نئے مذہب کی ترویج کے لئے مجوسی صوفی (THEOSOPHY) کا سہارا لیا مگر ایسے نظریات کو قبول کیا جو اسلامی اصولوں کے خلاف ہوں۔ آگے چل کر ان کے عقائد کے سلسلہ میں ہم اس کی مثالیں دیں گے۔ شروع میں دروزی تمام جزیرۃ العرب میں بکھرے ہوئے تھے لیکن دسویں صدی ہجری میں ان کے رہنماؤں نے ان کو لبنان میں جمع کر لیا جہاں یہ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اب ان کا اپنا ایک خانقاہی نظام ہے جس کا سربراہ موروثی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس گروہ میں شامل ہونا چاہے تو اسے ایک سال تک شدید اور اذیت ناک آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ وہی طریقہ ہے جو فری میسنز (FREE MASSONS) اختیار کرتے ہیں۔ دروزی اپنے انتظامی امور کے لئے ایک مخصوص اشاراتی زبان (CODE LANGUAGE) استعمال کرتے ہیں جسے کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔

دروزیوں کو اپنے ایرانی رہنما حمزہ سے اس قدر عقیدت ہے کہ وہ اس کو مسیحا کے خطاب سے یاد

کرتے ہیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ قارئین لفظ حمزہ سے غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، کیونکہ رسول مقبولؐ کے چچا کا نام بھی حمزہ تھا جن کو سید الشہداء کہا جاتا ہے۔ دروزی، حضرت علیؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کو سرور کائنات محمد رسول اللہؐ پر فوقیت دیتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کو مانتے ہیں مگر قرآن اور شریعت محمدیؐ کو نہیں مانتے۔ اسی حمزہ نے اپنے عقائد کی ایک کتاب چھ جلدوں میں لکھی جس کو دروزیوں نے قرآن کریم کے بدلے اپنی مذہبی کتاب قرار دیا ہے۔ حمزہ نے قرآن کو اپنا بیان اپنانے کی کوشش کی ہے جو بہت مذموم کام ہے کہ غیر مسلم مستشرقین نے بھی اسے ایک گھناؤنا فعل قرار دیا ہے۔ ان کی کتاب میں ایک سو گیارہ ابواب ہیں۔ یہ لوگ یہ افواہ پھیلاتے ہیں کہ قرآن کے بعد دوسری کتابوں کو آسمانی، یہ بات ہے جو شعوبیہ اور قرامطہ کی ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے۔ رسول عربیؐ اور قرآن عربی ان کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے جلال الدین رومی کی اس مثنوی کو جس میں بے شمار اشعار محل نظر ہیں اور خصوصاً یہ شعر

من ز قرآں مغز را برداشتم ‏ ‏ ‏ ‏ استخواں پیش سگاں انداختم

(ترجمہ: میں نے قرآن کا مغز تو اپنے لئے لیا ہے اور ہڈیاں کتوں کے آگے ڈال دی ہیں) قرآن بزبان فارسی قرار دیا "ہست قرآں در زبان فارسی" اس مثنوی کو کہنا قرآن کریم کی کھلی توہین ہے۔ مگر کوئی پوچھنے والا نہیں اللہ رحم کرے۔ یہ لوگ اپنی اس کتاب اور دیگر کتابوں کو سخت خفیہ رکھتے ہیں یہاں تک کہ کسی دروزی کو بھی دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ اس جگہ کا بھی پتہ نہیں ہوتا جہاں ان کتابوں کو رکھا گیا ہے۔ یہ کتابیں ان کے مذہبی رہنما جسے وہ "اکال" کہتے ہیں، کے قبضہ میں رہتی ہیں۔ دیگر خفیہ تحریکوں کی طرح دروزی بھی اپنے عقائد کو چھپاتے ہیں اور کسی کو اصل عقائد سے باخبر نہیں ہونے دیتے۔ ان کے بنیادی عقائد میں تناسخ (ہندی آواگون) اور تقیہ یعنی جھوٹ بولنا شامل ہیں۔ ان کی سب سے عجیب و غریب بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جمعرات کے دن ان کی عبادت میں شرکت کرے تو وہ اس اجنبی کے دین کے مطابق عبادت کرکے اسے مطمئن کر دیتے ہیں کہ یہ اس کے ہم عقیدہ ہیں۔ مثلاً یہاں اگر عیسائی ہے تو ان کا اکال تورات یا بائبل کی تلاوت کرے گا اور مسلمان کے لئے قرآن کی تلاوت کی جائے گی۔ اس طرح کسی کو بھی ان کے اصل عقائد کا پتہ نہیں چلتا۔ عیسائی اپنے حلقوں میں ان کو عیسائی بتاتا ہے اور مسلمان ان کو مسلمان کہہ دیتا ہے۔ دروزی اس بات کے پابند ہیں کہ اکال جو کچھ کہے اسے بے چون و چرا مان لیں۔ ان کے عقائد کا ایک مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

کیا دروزی رسول اکرمؐ پر حضرت علیؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کو فوقیت دیتے ہیں؟

(۱) خدا کا وجود تسلیم کرنا (۲) عقل کا مُنافی کو ماننا، (۳) روحانی رہنماؤں کا علم رکھنا (۴) نیز دشمن کو ماننا (۵) حمزہ کے دئے ہوئے سات بنیادی اصول تسلیم کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ان کے خیال میں قیامت کا دن نجات کا دن ہے جب ہندو عقیدہ کے مطابق روحوں کو بار بار پیدا ہونے کے چکر (آواگون) سے نجات مل جائے گی۔ یہ بھی ایک بدعت ہے کہ وہ محمد رسول اللہ اور قرآن کو نہ ماننے کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں جو ایک کھلا ہوا فریب ہے۔ فرمان حمزہ درج ذیل ہے۔

"مذہبی حکمت کو ان لوگوں سے چھپاؤ جو اس کے اہل نہیں ہیں لیکن ان سے نہ چھپاؤ جو اس کو سمجھنے کے قابل ہیں۔ کیونکہ جو اہل سے چھپائے یا نااہل کو بتائے وہ عقیدہ کو خراب کرتا ہے اور اخوان کو کھو دیتا ہے۔ تم اپنا احتساب کرتے رہو کہ کہیں تم اس اصول کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہے ہو۔"

یہ ہے دروزیوں کی حقیقت جس سے ہماری صحافی دنیا ناواقف ہے۔ ہمیں خبروں میں دروزی مسلمان کی بجائے صرف "دروزی" لکھنا چاہیے۔ (روزنامہ جنگ پاکستان)

(بقیہ [illegible])

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (البقرۃ ۱۳۵، ۱۳۶) — تمہیں کافی ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اہل کتاب اور دوسری قوموں پر ہی موقوف نہیں مسلمان امت سے بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ کسی قومی بنیاد پر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو "خیر امت"[1] اور "امت وسط"[2] کے بلند مرتبے پر فائز کیا ہے۔ لیکن یہ چیز بھی مطلق نہیں ہے بلکہ اخلاقی اوصاف کے ساتھ مشروط ہے۔ یعنی یہ کہ یہ امت "معروف" کا حکم دے گی، "منکر" سے منع کرے گی اور ایمان باللہ کے تقاضوں کو پورا کرے گی۔ نیز یہ کہ دنیا والوں پر "شہادت حق" کا فرض انجام دے گی[2] جس سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ اگر وہ ان اوصاف سے عاری ہو جائے تو خیر امت اور امت وسط کے بلند مقام سے بھی محروم ہو جائے گی۔ عمل سے خالی ہو کر اس کے لئے ان القاب کا استحقاق باقی نہیں رہے گا۔

[1] آل عمران: ۱۱۰ [2] بقرہ: ۱۴۳

ماسٹر حمید، بلریا گنج

یہ جامعہ انہیں کا خواب ہے

"ایک شفیق و مہربان انسان کی محنت اور لگن کی داستان، جنہیں موت کے آہنی ہاتھوں نے اپنی گرفت میں لے لیا!"

آج ۲۸ جنوری کو بعد نماز عشاء حکیم ایوب صاحب کے دروازے پر بیٹھا تھا کہ گاؤں کا ایک شخص یہ اطلاع لے کر آیا کہ حاجی محمد اکرم صاحب سابق ناظم جامعہ کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ خبر گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ راقم الحروف بھی ان کے مکان پر پہنچا۔ باوجود کڑاکے کی سردی اور تاریکی کے ان کا گھر اندر سے باہر سوگوار لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ گاؤں کا ہر غریب و امیر ہندو مسلم اپنے محسن کے آخری دیدار کے لئے جوق در جوق اکٹھا ہو گئے۔ اور اسی وقت یہ طے پایا کہ کل دو بجے نماز جنازہ ادا کی جائے گی۔ دوسرے دن حسب معمول میں جب جامعہ حاضر ہوا تو پورا جامعہ غم اور سوگ میں ڈوبا ہوا دکھائی دیا۔ جہاں ایک طرف طالب علموں کی طرف تو دوسری طرف ان کمروں کی طرف اٹھتی تھی، جو ان کے مقدس ہاتھوں نے تعمیر کرائے تھے۔ جامعہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ آج جامعہ اپنے محسن کے سوگ میں تعلیم بند رکھے گا، اور ایک تعزیتی جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ناظم جامعہ سمیت تمام اساتذہ و طلبہ موجود تھے۔

حاجی اکرام صاحب مرحوم تنہا ایک انجمن تھے۔ آپ خوش مزاج بچوں میں بچہ، بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان رہتے تھے۔ آپ ایک معمولی کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کمسنی میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے آپ کی تعلیم بھی مکمل نہ ہو سکی۔ آپ معمولی پڑھے لکھے تھے بمشکل اردو پڑھتے اور دستخط وغیرہ کر لیتے تھے۔

جامعہ وقت گزرنے کے ساتھ ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے جب ۱۹۵۹ء میں داخل ہوا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اب اسے مدرسہ سے جامعہ بننا ہے اور یہیں اعلیٰ تعلیم کے علمی مراحل طے کئے جائیں گے۔ لہٰذا اس وقت کے موجودہ ناظم حاجی عبدالمجید صاحب مرحوم و مغفور نے یہ ذمہ داری اٹھائی اور حاجی محمد

ذکر اور صاحب کے حوالہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور کام بڑھتا جا رہا ہے۔ اس لئے یہ کام ایک جوان سال جوانمرد، دھن کے پکے انسان کے حوالے ہونا چاہئے۔ اور حاجی محمد اکرام صاحب کے ہاتھوں اس کا نام جامعہ اسلامیہ رکھا گیا۔ انھیں تحویل جامعہ سے کل پندرہ پیسے عطا کئے گئے۔ اس وقت مدرسین کی تعداد پانچ تھی جن کی کل تنخواہ ۲۶۰ روپے ماہوار بنتی تھی۔ موصوف مرحوم ان کے معاون سکریٹری جامعہ جناب ڈاکٹر خلیل احمد صاحب، ان کے ساتھیوں، اساتذہ نیز طلبہ کی کاوشوں سے جامعہ روز افزوں ترقی کرتا رہا اور جب تحویل ۱۴ روپے کو پہنچی تو ایک نئی عمارت کی بنیاد جو چار بڑے کمروں دو چھوٹے کمروں اور ایک ہال پر مشتمل تھی جسے اب موجودہ ہاسٹل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ موصوف اس کی تعمیر میں بالکل مزدوروں کے شانہ بشانہ پھاوڑہ چلاتے، مٹی کی ٹوکری سر پر ڈھوتے اور کبھی سلاخوں کے بنڈل کا ایک سرا خود تو دوسرا سکریٹری (ڈاکٹر خلیل) کے کندھوں پر ہوتا تھا۔ اس طرح سے بے سروسامانی اور کم سرمایہ کے باوجود ایک ایسی عمارت تعمیر ہو گئی جو جامعہ کے لئے نہایت موزوں اور مناسب تھی۔ اس کے بعد بچوں کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا۔ موصوف نے بمبئی، ملیشیا وغیرہ کا جامعہ کی مالی تعاون کے لئے سفر کیا۔ اس طرح جامعہ روز بروز ترقی کی منازل طے کرتا ہوا تین سال بعد جامعۃ الفلاح بن گیا۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ جامعہ کا دستور جامعہ کی باڈی باقاعدہ عمل میں آئی اور اس کے لئے یہ طے کیا گیا کہ یہاں ایسے افراد تیار کئے جائیں گے جو دینی علم پر گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ سے آراستہ ہوں گے اور باطل افکار و نظریات سے بھرپور واقف ہونے کے ساتھ اسلام کے داعی کی صورت میں ابھریں گے۔ جو ملک و ملت میں ایک داعی کا صحیح کردار ادا کر سکیں گے۔ یہ سب کچھ ایسے انسان کے ہاتھوں ہوتا رہا جس کا کل کا سرمایہ ذوق عبادت، شب کو پڑھنا اور دستخط کرنا تھا اور جو ایک معمولی کسان کی حیثیت سے زندگی گذار رہا تھا لیکن خلوص بہت اور اس کے صحیح مشیر کاروں کے تعاون و جذبۂ عمل نے ایک عظیم کام کے لائق بنا دیا۔ آج زندگی کا مقصد لئے ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ موصوف کے اندر خلوص کے ساتھ ساتھ بے پناہ قربانی کی ایک ادنیٰ مثال سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ ایک عظیم انسان ہونے کے ساتھ ساتھ خلوص و قربانی کے پیکر تھے۔ شہر بلریا گنج کی ترقی کے پیش نظر موصوف نے اپنا مکان معمولی قیمت کے عوض دے کر خود ایک دوسری زمین پر جا بسے۔ موصوف ہمیشہ جامعہ کی ترقی و تعمیر کے لئے کوشاں رہے۔

متاعِ آخرِ شب

جناب حفیظ میرٹھی کا دوسرا مجموعۂ سخن

بڑے انتظار کے بعد حلقۂ تحریک اسلامی کے نامور اور ممتاز شاعر جناب حفیظ میرٹھی کا دوسرا مجموعۂ کلام "متاع آخر شب" منظر عام پر آیا۔

عمدہ کتابت، روشن طباعت، سفید اور دبیز کاغذ اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ "متاع آخر شب" کو دیدہ و دستاویز کا حقیقی کہا جا سکتا ہے۔ "متاع آخر شب" اپنی تمام تر صوری و معنوی خوبیوں کے باوجود اپنے دامن میں بے پناہ سادگی سمیٹے ہوئے ہے۔ ایسی سادگی جس پر ہزاروں پرکاریاں اور رنگینیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ بالکل بھائی حفیظ کی شخصیت و مزاج کی آئینہ دار۔

بلاشبہ ان تمام صوری و ظاہری خصوصیات کا سہرا برادرم رفیق احمد (مالک الکتاب پبلشرز حیدرآباد) کے سر بندھتا ہے۔ موصوف اپنے اس عزم کا اظہار اب سے تقریباً دو سال قبل لندن کی ملاقات کے موقع پر فرما چکے ہیں۔ اس سلسلے میں جہاں بھائی حفیظ صاحب ہدیۂ تبریک و تہنیت کے مستحق ہیں وہیں برادرم رفیق احمد بھی تحفۂ تحسین و تشکر کا پورا پورا حق رکھتے ہیں۔

جناب حفیظ حلقۂ تحریک اسلامی کے مقبول و ہر دل عزیز شاعر ہیں۔ عہد حاضر کے معروف نقادوں میں جناب ڈاکٹر احمد سجاد صاحب، جناب پروفیسر عبدالمغنی صاحب اور جناب اختر انصاری دہلوی نے انھیں عظیم شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور غزل کی روایت کا پاسدار بتایا ہے۔ اسی طرح سے مستقبل میں بھی بہت کچھ ان کی شاعری کے تعلق سے لکھا جا سکتا ہے اس لئے کہ وہ اس بات کا پورا حق رکھتے ہیں کہ ان پر بہت کچھ لکھا جائے اور مسلسل لکھا جاتا رہے تاکہ آئندہ نسل پاکیزہ اور صالح ادبی سرمائے سے واقف ہو سکے۔

جناب حفیظ میرٹھی کی شہرت کا اشتہار دیوار ذہن پر بہت پہلے چسپاں ہو گیا تھا۔ رسائل و جرائد کے توسل سے کچھ اشعار بھی یادداشت کے ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ ہو گئے تھے۔ لیکن ان سے صحیح معنوں میں اس وقت متعارف ہو سکا ہوں جب ۱۹۷۶ء کی کسی تاریخ کو میرٹھ کے ایک مشاعرہ

ہے ان کا یہ شعر سنا ؎

نہ لے چل خانقاہوں کی طرف تسبیح و حرم مجھکو
مجاہد کا تو مستقبل ہے میدانوں سے وابستہ

سچ پوچھیے تو اسی وقت اندازہ ہوا کہ حفیظ صاحب لوگوں کے ذہنوں میں کس طرح گھر کئے ہوئے ہیں اور یہ بھی جاننے کا موقع ملا کہ نظریہ و فکر کا یہ اہم پہلو کیسے اور غیر متمدن عوام کے منہ پر کس حکمت و دانائی کے ساتھ چپکایا جا سکتا ہے۔

لیکن اپنی دعوت کو ہر خاص و عام کے ذہنوں میں اتارنے کا فن کچھ ہی لوگوں کے حصے میں آتا ہے یہ کام کردار و عمل کی بلندی اور قول و عمل کی یکسانیت کے بغیر ممکن نہیں۔ حفیظ صاحب کا بھی یہی مسلک ہے ؎

تقریر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

میں نے حفیظ صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اور ان کے ساتھ دور دراز کے سفر بھی کئے ہیں لیکن ہر حال میں ان کی بلندی و عظمت میں اضافہ ہوا ہے۔ اور یہ کہنے کا موقع کبھی نہ ملا کہ میاں دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔

مجھے اب تک کی اپنی زندگی میں ایک شاعر مولانا شہباز صدیقی امروہوی مرحوم ایسے ملے ہیں جنکو شعراء میں پائی جانے والی تمام بے احتیاطیوں سے پاک و مجتنب کہا جا سکے۔ مولانا شہباز مرحوم نہ تو کوئی روایتی عالم تھے اور نہ طریقت و تصوف ہی کی کوئی نسبت انھیں حاصل رہی ہے لیکن اخلاق و مروت تدین و تشرع اور کردار و عمل کی جس بلندی پر نازاں تھے وہاں تک دیکھنے کے لئے بڑے بڑے مشائخ خانقاہ و ارباب تصوف کی دستاریں زمین بوس ہو جائیں گی۔ قول و عمل کی ایسی یکسانیت شعراء تو کیا غیر شعراء میں بھی شاذ و نادر ہی ملے گی۔

اس خصوص میں جناب حفیظ کو میں بلند سے بلند تر اور قابل رشک مقام پر فائز پاتا ہوں۔ "متاع آخر شب" ان کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ہے، پہلا مجموعہ اب سے تقریباً بیس سال پہلے مکتبہ دوام ٹانڈہ سے "شعر و شعور" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شعر و شعور پر تبصرہ کرتے ہوئے برصغیر ایشیا کے ممتاز ادیب، محقق، عالم دین، صحافی، اور ہر دلعزیز نقاد جناب مولانا عامر عثمانی مرحوم ایڈیٹر تجلی دیوبند نے ان کی شاعری کو غیر معمولی داد و تحسین سے نوازا تھا اور انھیں اسلام پسند شعراء کی اس صف میں جگہ دی تھی جو مولانا ماہر القادری اور مولانا نعیم صدیقی کے لئے مخصوص ہے۔ مولانا عامر

عثمانی جیسے بالغ نظر اور ژرف بیں نقاد و مبصر کی یہ داد و تحسین بہر حال ایک اہمیت رکھتی ہے اس لئے کہ جن لوگوں نے مولانا کی تنقیدوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ یہ بات بخوبی جانتے ہوں گے کہ مولانا مرحوم نقد و تبصرہ کے وقت خویش و بیگانہ کا فرق و امتیاز برتنے کے قائل نہیں تھے، جو بات بھی سچ سمجھتے بے لاگ، بے لوث اور دو ٹوک انداز میں کہتے تھے۔

ہر چند کہ "متاع آخر شب" کا تعارف حفیظ صاحب کے دوسرے مجموعہ سخن کی حیثیت سے کرایا گیا ہے تاہم اس میں خاصی تعداد میں "شعر و شعور" کی بھی غزلیں شامل ہیں، اس صورت سے اسے انکی اب تک کی شاعری کا نچوڑ بھی کہا جا سکتا ہے۔ "متاع آخر شب" میں زیادہ تر وہی غزلیں شامل ہیں جو خود حفیظ صاحب ہی کی زبان سے مشاعروں اور اجتماعات میں سنی جا چکی ہیں اور عوام و خواص میں مقبول ہیں۔ ساتھ ہی درجنوں اشعار ایسے بھی ہیں جو شہرت و مقبولیت کی حدوں کو پھلانگ کر ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ مثلاً ؎

پاسباں آنکھیں ملے انگڑائی لے آواز دے
اتنے عرصے میں تو یہ کام کر جاتی ہے آگ

ابھی کیا ہے کل اک اک بوند کو ترسے گا میخانہ
جو اہل ظرف کے ہاتھوں میں پیمانے نہیں آئے

بات کو رندانہ کہہ دیا ہے
سنتے ہی بوکھلا گئی دنیا

شیشے ٹوٹے غل مچ جائے
دل ٹوٹے آواز نہ آئے

جان ہتھیلی پہ رکھ لے
کہنی ہے گر سچی بات

کیسے اللہ والے ہیں یہ بے خدا
گفتگو مشورے، قتل انسانوں کی طرح

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی
میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

کوئی فریب نہ کھائے سفید پوشی سے
نہ جانے کتنے ستارے نگل گئی ہے سحر

یہ بات نرالی دل خود دار کرے ہے
تڑپے ہے مگر درد سے انکار کرے ہے

حفیظ صاحب کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو بات بھی کہنا چاہتے ہیں کھل کر کہتے ہیں، کسی قسم کی لاگ لپیٹ یا اشارہ و کنایہ کا سہارا لینا ان کے مسلک کے خلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ ؎

اب کھل کے کہو بات تو کچھ بات بنے گی
یہ دور اشارات و کنایات نہیں ہے

اور جب کھل کر بات کہنے پر آتے ہیں تو ان کے اس طرح کے شعروں سے فضا گونج اٹھتی ہے، مثال کے

جرائد کی دنیا میں دھوم مچ جاتی ہے کہ :-

اس دور نے ضمیر میں جینا سکھا دیا — حالات نے ہمیں بھی منافق بنا دیا

ضروری ہے کفن بردوش رہنا — دھن ہے کوچۂ قاتل ہمارا

وہ کہ دنیا میں نہیں منظور — ظلم اجاز بنا کام کرو

حصارِ جبر میں زندہ بدن جلائے گئے — کسی نے دم نہیں مارا مگر دھواں بولا

حالانکہ ان کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ ان کی یہ راست بیانی و صدق گوئی ان کی مادی ترقی میں حارج ہے اور یہ بات آپ کے ہمارے اور ہر صاحب نظر کے مشاہدے میں آچکی ہوگی کہ ملک کی اسی ادبی و شعری دنیا میں تملق و کاسہ لیسی اور ایوان اقتدار کا سہارا لے کر کتنے ہی معمولی درجے کے شعرا غیر معمولی قدر و منزلت اور بے پناہ منفعت حاصل کر چکے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ :-

تم بھی دربار میں حاضری دو حفیظ — پھر رہے ہو کہاں مفلسوں کی طرح

حفیظ میرٹھی کو کون جانے وہ کہ بیچارہ — زلیخاؤں سے وابستہ نہ درباروں سے وابستہ

لیکن انھیں اپنی اس محرومی و ناقدری پر تاسف نہیں، وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں :-

ناز برداری نہ کیجیے اہل دولت کی حفیظ — رفتہ رفتہ حاشیہ بردار ہو جائیں گے آپ

حفیظ میرٹھی ایک مومن و مسلم شاعر ہیں۔ وہ اپنی زندگی اور شاعری کو اپنے نصب العین کیلئے وقف کر چکے ہیں اور ان کا نصب العین ہے دنیا میں صالح نظام کے قیام کی جدوجہد۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں اور انھیں طنز و تکفیر سے نوازا جا رہا ہے اور اس میں وہ لوگ پیش پیش ہیں جنھیں خود اس کام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے تھا۔ تو نہایت تحسر کے ساتھ فرماتے ہیں :-

سر کٹ ہم جو چلے دین کی نصرت کو حفیظ — کفر کا فتویٰ لگا شیخ حرم کے ہاتھوں

حفیظ صاحب کی غزل کا مقطع ہے :-

نیاز و ناز کی لذت حفیظ سے پوچھو — خدا شناس بھی ہے وہ خود شناس بھی ہے

بجا طور پر یہ شعر حقیقت کے عین مطابق ہے۔ خدا شناسی اور خود شناسی کے بغیر ایسی راست و صالح شاعری ممکن نہیں۔

(بقیہ ص ۱۴ پر)

حلقۂ یاراں

مجلہ حیات نو فروری ۱۹۸۸ء میں ایس آئی او کی آل انڈیا کانفرنس منعقدہ ۲۶، ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۸۷ء سے متعلق ایڈیٹر کا ایک مضمون شائع ہوا جس پر اپنے طلبائی بھائیوں کی طرف سے ہمیں شدید رد عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب میں اپنی ایک ضرورت سے ۱۳ مارچ ۱۹۸۸ء کو علی گڑھ گیا اور ملاقات کی غرض سے ۱۴ مارچ کو شمشاد مارکیٹ پہنچا جہاں اکثر طلبائی مطالعہ کے لئے موجود رہتے ہیں تو مجاہد فلاحی وغیرہ نے کہا کہ فروری کا شمارہ تو کوئی لے ہی نہیں رہا ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ بنگلور کی کہانی کی وجہ سے ہر ایک اس کا بائیکاٹ کر رہا ہے۔ چند نامشدہ خطوط شامل اشاعت ہیں اس معذرت کے ساتھ کہ ہم چاہتے ہیں ہر ایک گہرائی کے ساتھ انجمن کے مقاصد، طریقہ کار اور پالیسیوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔"

(ایڈیٹر)

مکرمی و محترمی جناب ایڈیٹر صاحب حیات نو! — السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

دسمبر کا "حیات نو" نظروں سے گزرا۔ جس وقت حیات نو برادرم محمد نے دیا اس وقت تک حیات نو کی توسیع و اشاعت اور زیادہ سے زیادہ اس کے معیار کو بلند کرنے کی بابت سعی و جہد میں مشغول تھے کہ یہ اندوہناک اطلاع ملی کہ "حیات نو" کے ایڈیٹر نے استعفیٰ دے دیا ہے قطع نظر اس سے کہ یہ استعفیٰ کن اسباب و وجوہ کے باعث دیا گیا، حیات نو کی نشو و نما و تعمیر و ترقی میں بدنما داغ ہے۔ ابھی حیات نو کے مستقبل کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ فروری کا "حیات نو" جسے ایس آئی او کا آرگن کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، نظروں سے گزرا، اور یہ دیکھتے ہی "حیات نو" کی پالیسیوں اور طریقہ کار کا خون آنکھوں میں سما گیا۔ "بنگلور میں ۳ دن" عنوان کے تحت دس صفحات لکھ کر جس طرح آپ نے امانت میں خیانت اور ایس آئی او کے نصب العین و طریقہ کار کو بلا قانون الٰہی پیش کر کے اس سے وابستگی کا حق ادا کیا؟ وہ قابل افسوس ہے۔ خدارا حیات نو کے مقاصد، طریقہ کار، نصب العین کو مد نظر رکھ کر اس کی تعمیر و ترقی

کے لئے سوچئے اور تنظیمی مفاد کے حصول کے لئے، حیات نو کے مستقبل کو تابناک بنائیے۔

والسلام۔ اعجاز ندوی

برادرِ محترم! سلام مسنون، خدا کرے بخیر ہوں

ماہ فروری کا شمارہ نظر نواز ہوا، مولانا عبدالمجید ندوی کا مضمون اگر اس قدر ہے تو ایک ہی قسط میں آ جانا چاہئے تھا۔ محی الاسلام صاحب کا مضمون بھی عمدہ ہے لیکن بجائی شوریٰ کی طے کردہ پالیسیاں کہاں آپ نے پھینک دی ہیں؟ کانفرنس سے متعلق رپورٹ اور پھر اس پر اداریہ کیا ہماری پالیسی کے خلاف نہیں ہے؟ ہمارے لئے تحریکی رسالے کافی تھے حیات نو کو بوجھل بنانا کہاں کی دانشمندی ہے، اس سے پہلے بھی مختلف موقعوں پر دانستہ یا نادانستہ اس طرح کی چیزیں چھپتی رہی ہیں۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا آپ نے طے کر لیا ہے کہ شوریٰ کے فیصلوں کو وہ خود رد نہ سمجھیں گے۔

ہونا تو یہ تھا کہ آپ نے دس صفحات سیاہ کر دئیے لیکن عبدالمجید ندوی صاحب کے لئے اتنی جگہ نہ نکال سکے کہ مضمون ایک قسط میں آ جاتا اور بابری مسجد کی رپورتاژ کی کیا ضرورت تھی۔ یہ سارى خبریں اخبارات میں آ چکی ہیں ان پر کافی رد ہو چکی ہے آپ نے اسے حیات نو میں شامل کر کے کیا کارنامہ انجام دیا ہے؟

الفاظ بہت سخت ہیں جس کے لئے معذرت خواہ ہوں لیکن جذبات کی شدت سے آپ کو آگاہ کرنا بھی ضروری تھا کیونکہ حیات نو ہمارے دلوں کی دھڑکن ہے۔ دوسری بات کا وضاحت چاہتا ہوں برادرِ محترم شوریٰ کے فیصلوں کو اہمیت دیجئے، شورائی نظام کی اہمیت تحریک کے لوگوں کو زیادہ بہتر طور سے سمجھنا چاہئے۔ بقیہ حیات نو کی طباعت وکتابت اور ترتیب وغیرہ سے متعلق تو بہت خوب تر کی جدوجہد لائق ستائش ہے۔ دعا یہ ہے کہ آپ نے اسے تسلسل دے کر حیات نو بخش دی ہے برادرِ محترم اپنے احساسات کے مد نظر دوسروں کے جذبات کی رعایت بھی ملحوظ رکھئے۔ شکریہ

بقیہ صفحہ ۴۴ پر آپ کا۔ عبیداللہ فہد فلاحی

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے
(اقبال)

اداره

جامعہ کے لیل و نہار

جامعہ میں ادبی موسم بہار فروری ۱۹۸۸ء کا مہینہ جامعہ کے لئے مہمانوں کی آمد کی وجہ سے موسم بہار کی حیثیت [illegible] گیا تھا۔ ۲۔ ۳ فروری ۱۹۸۸ء کو مجلس تعلیمی کی میٹنگ تھی اور ۱۱، ۱۲ فروری ۸۸ء کو انجمن طلبہ [illegible] شوریٰ کی، مجلس تعلیمی کے ممبران میں مولانا صدر الدین اصلاحی ناظم جامعہ، مولانا سید حامد علی، جناب [illegible] ناظم مرکزی درسگاہ اسلامی، ایجو وغیرہم تشریف لائے۔ اسی موقع پر [illegible] اسلامی شاعر اور ماہنامہ حجاب کے ایڈیٹر مائل خیرآبادی صاحب بھی تشریف لائے جامعہ کے [illegible] مولانا سید حامد علی اور مائل خیرآبادی سے خوب خوب استفادہ کیا۔

انجمن طلبہ [illegible] شوریٰ کا اجلاس ۱۱ فروری ۱۹۸۸ء کو بعد نماز مغرب انجمن طلبہ قدیم جامعہ کی شوریٰ کا اجلاس [illegible] ہوا اور مختلف مسائل زیر بحث رہے۔ نسیم احمد غازی فلاحی، نور محمد فلاحی [illegible] فلاحی، مولانا [illegible] فلاحی، مولانا مطیع اللہ فلاحی، ابوالمکارم فلاحی، عبیداللہ فہد فلاحی، معین فلاحی، محی الاسلام فلاحی، [illegible] فلاحی، طارق فاز تلیط فلاحی، مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی، انجم [illegible] احمد فلاحی، جاوید اشرف فلاحی وغیرہم شریک اجلاس رہے۔

نئے سکریٹری کا تقرر ۱۱ فروری کو شوریٰ میں مولانا نور محمد فلاحی سابق سکریٹری کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا اور [illegible] جاوید اشرف فلاحی کو انجمن کا سکریٹری بنایا گیا۔ نور محمد صاحب اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی [illegible] نور محمد صاحب نے اپنے دور میں انجمن کی بڑی خدمت کی حیات نو مسلسل ڈھائی سال تک نکالتے رہے ان کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جانا چاہئے۔

مجلس ادارت حیات نو کا فیصلہ نئے ایڈیٹر کی خدمات طارق فاز تلیط کا استعفیٰ ۱۱ فروری ۸۸ء کو انجمن کی شوریٰ نے منظور کر لیا اور مولانا رحمت اللہ اثری کی خدمات حیات نو کے لئے حاصل کر لی گئی ہیں۔ خدا ہم سب کی مدد فرمائے۔

مولانا محمد شفیع مونس کا طلبہ سے خطاب

سکریٹری جماعت اسلامی ہند مولانا شفیع مونس صاحب اور امیر حلقہ یوپی رفیق احمد قاسمی صاحب ... فروری کو بلریا گنج تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر موصوف جامعہ بھی تشریف لائے طلبہ نے ان سے استفادہ کی غرض سے مولانا شفیع مونس صاحب کو خطاب کی دعوت دی موصوف نے طلبہ کو بڑی مفید باتیں بتائیں۔

طلبہ کے مقابلے

جمعیۃ الطلبہ کے تحت طلبہ کے قرأت، اردو، انگریزی اور عربی تقاریر نیز اردو انگریزی اور عربی کے مختلف تحریری انعامی مقابلے منعقد ہو رہے ہیں۔ اول، دوم اور سوم انعام حاصل کرنے والوں کے نام اگلے شمارہ میں دئے جائیں گے۔

جامعۃ الفلاح کے سابق ناظم انتقال کر گئے

۲۰ر جنوری ۹۹ء کی شب میں جامعہ کے ایک بڑے محسن دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ موصوف کے انتقال پر جامعہ میں ایک تعزیتی اجلاس منعقد کیا گیا۔ مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی صدر جامعہ نے اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ جامعہ کی تاریخ میں یہ دن بڑا کرب انگیز ہے۔ یہ دن جامعہ کے اولین بانیوں میں سے ایک فرد کی رحلت کا دن ہے۔ حاجی صاحب کا گو کہ صاحب علم و فضل میں شمار نہ ہوتا تھا لیکن خلوص و محبت میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ وہ جامعہ کے لئے ایک مزدور کی طرح کام کرتے۔ ان کی خوش نصیبی قابل رشک تھی کہ وہ ایک ایسے گھر کی تعمیر کر رہے تھے جس میں قرآن و حدیث کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ جامعہ انھیں کا خواب ہے۔

مولانا شبیر احمد اصلاحی اور مولانا منیر احسن اصلاحی نے فرمایا کہ ہم علم و عمل کے پیکر بن جائیں یہ بہترین خراج عقیدت ہے۔ مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی نے فرمایا۔ مودودی ہاسٹل کی بنیاد انھیں کے زمانے میں ڈالی گئی۔ ماسٹر جنید صاحب نے فرمایا کہ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے جامعہ کی نظامت سنبھالی اور بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ حمید الحق صاحب مرحوم ان کا دایاں بازو تھے، دونوں نے جامعہ کے لئے بہت کام کیا ہے۔ خدا انھیں غریق رحمت کرے۔ نائب ناظم جامعہ جناب منشی محمد انور صاحب نے فرمایا حاجی صاحب نے تعمیرات کے سلسلے میں آنے والوں کو ایک راہ دکھائی۔ موصوف کے لئے ہم دعائے مغفرت کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔

(بقیہ ص ۱۲ پر)